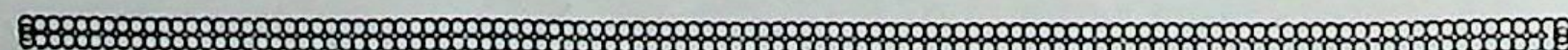
صحرا صحرا



سیفی سوپوری

صحرا صحرا

سیفیؔ سوپوری

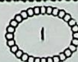


نام کتاب	صحرا صحرا
مصنف	سیفؔی سوپوری
تاریخ	فروری ۲۰۱۱
کمپیوٹر کمپوزنگ	رفیع احمد مسعودی
سرورق	نیاز احمد میر
صفحات :	
قیمت:	300 روپے

رابطہ: رفیع احمد مسعودی

محلہ اویسیہ ماڈل ٹاون-"اے" سوپور کشمیر

Email:masoodirafi@gmail.com



سیفی سوپوری

نام: سیف الدّین (مسعودی)

ولدیت: مولانا مولوی غلام رسول مسعودی بلند پایہ، عالمِ دین۔

تاریخ ولادت: ۱۹ جنوری ۱۹۲۲ء

مقام ولادت: حاتی شاہ سوپور کشمیر

سکونت (حال): نیو کالونی سوپور

تعلیم

ا۔ میٹرک ۱۹۳۷ء گورنمنٹ ہائی سکول سوپور (پنجاب، لاہور)

ب۔ تعلیم دین (عربی فارسی): مدرسیہ نصرت الحق امرتسر

منشی فاضل (Honours in persian)۱۹۴۱ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ (نصرت الاسلام کالج امرتسر)

ت: بی۔اے (پنجاب یونیورسٹی لہور ۱۹۴۸)

ٹ: بی ایڈ (کشمیر یونیورسٹی سرینگر)

ج: ب۔ای۔سی (محکمہ تعلیم سرینگر)

وہ علوم جن سے گہرا رابطہ رہا:

نفسیات، فلسفہ، علوم دین، تنقید

ملازمت

بحثیت :

مدرس محکمہ تعلیم ۱۳ اپریل ۱۹۴۴

ہیڈ ماسٹر ہائی سکول سوپور

پرنسپل ہائر سیکنڈری سکول ہندوارہ، سوپور، بانہال

تحصیل ایجوکیشن آفیسر سوپور، بارہمولہ

ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر بارہمولہ۔ لداخ (۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۲ء)

ڈپٹی ڈائریکٹر نان فارمل ایجوکیشن Dy. Director Non Formal Education

ریٹائرمنٹ فروری ۱۹۷۷ء

خصوصیات علمی وادبی کارگذاری

شعروادب: فارسی غزل سے ابتدا کی اور طبیعت اردو کی طرف مائل ہوئی۔

تراجم

غیر مطبوعہ (Unpublished)

ا۔ فارسی سے کشمیری:۔

کیمیائے سعادت مصنفہ حضرت امام غزالیؒ (مکمل)

۲۔ انگریزی سے اردو:۔

(الف) وجودیت مصنفہ میک قویری (مکمل)

(ب) چھ وجودی مفکر مصنفہ بلیکہم (مکمل)

۳۔ عربی سے کشمیری (صرف ونحو):۔

شرح مأتہ عامل مصنفہ حضرت برجائیؒ

۴۔ انگریزی سے کشمیری:۔

(ا) مقالہ وجودیت مصنفہ ژاں پال سارتر

(ب) لوگوتھیرے پی (Logotherapy) وجودیت اور سایکوتھیرے پی مصنفہ ڈاکٹر وی۔ ای۔ فرینکل (تراجم جاری)

اعزازات

۱۔ فیلو کشمیر یونیورسٹی (Fellow Kashmir University) اردو ۱۹۸۲ء

۲۔ پہلا انعام اردو نظم ''جھیل ڈل اور چاندنی رات'' (موضوعی مشاعرہ محکمہ تعلیم ۱۹۵۹ء)

۳۔ خلعت حاجنی (۲۰۰۸ء) حلقۂ ادب سوناواری حاجن

عرض حال و تشکر

میں نے ۱۹۳۷ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ میرے قبلہ گاہ نے مجھے حصول تعلیم دین کے سلسلے میں امرتسر بھیجنا مناسب سمجھا۔ یہاں مجھے دو جیّد علماء سے شرف تلمذ حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ عربی صرف ونحو، فقہ اور ادب کے ابتدائی رسائل میں نے حضرت غلام احمد احرارؒ کی بے مثال تدریس میں مکمل کئے۔ اور اس کے بعد آگے چل کر انہیں مضامین کی فزوں تر کتابیں حضرت مولانا عبدالکبیرؒ سے پڑھیں۔ ان دونوں حضرات کا معیار تدریس بے مثال تھا۔ بڑی شفقت سے پڑھاتے تھے اور ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ طلباء رموزِ دین کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کریں۔

رات کو ہم نصرت الاسلام کے شبانہ کالج میں منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کے کورس، جو بہت مشکل ہوا کرتے تھے بہت ہی قابل پروفیسر صاحبان سے پڑھا کرتے تھے۔ اس کالج کے پرنسپل مولانا غلام محمد ترنم تھے جو خود بھی طلباء کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ان کی تخلیقی قوتوں میں

اضافہ کرنے کی مسلسل کوشش کرتے تھے اور ہم فارسی شعراء کی تخلیقات کی گہرائیوں میں اتر کو شوق شعروادب سے بہرہ ور ہوئے۔ یہاں جو پروفیسر صاحبان درس وتدریس پر مامور تھے وہ فارسی شعروادب کا بہت ہی بلند معیار رکھتے تھے۔

میں نے ساتھ ہی ساتھ امرتسر میں ایف اے کا امتحان پاس کیا اور مئی ۱۹۴۲ء میں واپس کشمیر لوٹ آیا۔ یہاں اس وقت محکمہ تعلیم کے سربراہ جناب خواجہ غلام السیدین تھے اور ہر طرف مدارس میں بنیادی تعلیم کے چرچے عام تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ میں پرایوٹ تور پر بی۔ای۔سی، کی ٹرینگ حاصل کروں۔ ٹرینگ سے فراغت پا کر ۱۳ اپریل ۱۹۴۴ء کو میں بحثیت مدرس تعینات ہوا۔ یہاں چونکہ مجھے ہر طرح کی فراغت حاصل تھی، تو میرے شعروادب کے شوق میں پھر سرسراہٹ ہوئی اور مقامی اخباروں میں میری اردو غزلیں شائع ہونے لگیں۔ اس وقت ہندوستان انگریزوں کے تسلط میں تھا اور سارا ملک حصول آزادی کیلئے مضطرب تھا۔ چنانچہ ہم نوجوانوں میں بھی اس تحریک کے اثرات مترتب ہوئے، میں نے ان دنوں اپنی ایک غزل میں جو مقامی اخبار میں شائع ہوتی تھی کہا ہے۔

ہم آزادی کی خاطر جان تک قربان کردیں گے
کمر بستہ ہمارا حلقہ اجباب ہے ساقی

میں اردو میں لکھتا رہا اور اس میٹھی زبان کی گرفت میری تخلیقی قوتوں پر اتنی مضبوط تھی کہ مجھے کسی اور طرف توجہ دینے کا موقع ہی فراہم نہ ہوا۔ چنانچہ میرا یہ شعری مجموعہ جو میری تمام عمر کا اثاثہ ہے، آپ کے مبارک ہاتھوں میں آیا ہے۔

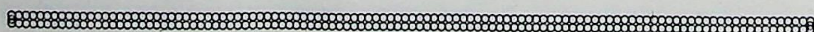
اس شعری مجموعے کو ترتیب دینے میں، میں جن حضرات کا شکرگزار ہوں ان میں سب سے پہلے میرے برادر اصغر رفیع احمد مسعودی کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے بڑی مشقت سے اس سارے مجموعے کو پڑھا اور اسے حسن ترتیب سے نوازا۔ وہ اس میں دن رات مصروف رہے۔ اس کے بعد میں جناب رفیق راز صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے اس مجموعے کیلئے تعارفی الفاظ مرحمت فرمائے۔

اس تخلیقی سفر میں جن حضرات کا حوصلہ افزا تعاون مجھے حاصل رہا ان میں کشمیر کے سبھی اردو لکھنے والے شامل ہیں۔ میں یہاں خصوصی طور پر کشمیر یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ اکا انتہا درجہ ممنون ہوں جہاں کے اساتذہ کرام نے میرے کلام کو اپنی پذیرائی سے نوازا۔ ان میں جناب پروفیسر بشیر احمد نحوی جو ان دنوں شعبہء اردو میں اپنی قابلیت کی تنویر سے طلباء کے اذہان کو منور فرماتے تھے اور اب محکم اقبالیات کے سربراہ ہیں، کا نام

پیش پیش ہے۔ میں ان دنوں کشمیر یونیورسٹی کے محکم اردو میں فیلو کی حیثیت سے منسلک تھا۔ اور مجھے اردو کے اچھے لکھنے والوں سے مسلسل ملنے کا شرف حاصل رہا۔

مذید برآں احباب میں بے شمار نام ایسے ہیں جن کی حوصلہ افزائی کے سامنے میرا سر ادب واحترام سے جھک جاتا ہے۔ عزیز محترم جناب ڈاکٹر رفیق مسعودی جواب ڈائریکٹر جنرل دوردرشن کے قابل فخر عہدے پر فائز ہوئے ہیں، میرے مداحوں میں سب سے پہلے یاد آتے ہیں۔ خود بھی بہت بڑے ادیب ہونے کے ناتے ان کے ساتھ جب بھی گفتگو کا موقع ملا وہ میرے لئے انتہا درجہ حوصلہ افزا تھا۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میرے اس کلام پر جناب قافلہ سالار ادب والانتقاد شمس الرحمان فاروقی صاحب نے اپنی گراں قدر رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ باوسف اس کے کہ انہیں بلند تر مشاغل ادب سے فرصت حاصل نہیں تھی۔ ان کے یہ الفاظ میرے لئے کتنی بڑی سعادت ہیں یہ میرا دل ہی جانتا ہے اور تشکر و امتنان کے جذبے کے تحت جب بھی مجھے یہ احسان یاد آتا ہے تو میرا سر ادب واحترام سے جھک جاتا ہے۔



(میں یہاں جناب شوکت شفیع / مسعودی Assistant
Deen Students Welfare K.U.) کا انتہائی درجہ شکر گزار ہوں کہ اس مجموعے کی اشاعت میں جس دلچسپی کا اظہار انہوں نے کیا وہ الفاظ تشکر سے بالاتر ہے۔ وہ خود بھی شعر و ادب میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، اور ان کی دلچسپیاں معمولی حدوں سے متجاوز ہیں۔

میں اپنے برادران عزیز غلام نبی مسعودی سابق جوائنٹ ڈائریکٹر، اپنے فرزندان ڈاکٹر زہر سعودی، اور فاروق احمد مسعودی پیرزادہ عبدالرشید (مرحوم) پیرزادہ غلام حسن، ڈاکٹر فطغر مسعودی عزیز محترم انور سلیم، عزیز اطہر مسعودی ڈاکٹر فیصل مسعودی اور انجیز فیض مسعودی اور دیگر احباب کا بھی بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس دیوان کی اشاعت میں ہر وقت میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

سیفی سوپوری
نیو کالونی سوپور
۱۹۳۲۰۱ کشمیر۔
email:

......تعارفی اِرشادات جناب رفیق راز......

میرے طالب علمی کے زمانے میں ''ستر کی دہائی'' میں سری پرتاپ کالج میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس میں جموں و کشمیر کے اُردو شعرا شریک تھے۔ شعرا میں سے کچھ بزرگ شعراء بھی شامل تھے۔ ڈائس میں بیٹھے ایک بزرگ باریش شاعر پر میری نظریں جم گئیں۔ میں صف سامعین میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ شاعر کون ہوسکتا ہے۔ اسے میں نے پہلے کسی مشاعرے میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پہلو میں بیٹھے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا کہ اس شاعر کا کیا نام ہے۔ اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرا تجسس بڑھ گیا۔ اس کا چہرہ مجھے نورانی لگ رہا تھا اور میں مشاعرے کی کار روائی شروع ہونے کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔

میں ان صاحب کا نام جاننا چاہتا تھا۔ مشاعرے کی کارروائی شروع ہوئی اور شعراء حضرات باری باری میکروفون کے سامنے آ کر کلام سنانے لگے۔ کچھ شعراء کو پسند کیا گیا، کچھ کو غور سے سنا گیا اور کچھ ہوٹنگ کی نذر ہو گئے۔ مشاعرہ میں شعراء کی تعداد پندرہ بیس شعراء سے زیادہ نہ تھی۔ میرے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اناونسر کی آواز گونجی ''اب جس شاعر کو میں

دعوتِ سخن دینے جا رہا ہوں، وہ سوپور سے تشریف لائے ہیں اور کشمیر کے کہنہ مشق اُردو شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ میری مراد جناب سیفی سوپوری سے ہے"۔

جناب سیفی سوپوری مائیک کے سامنے تشریف لائے اور میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ دل میں خیال آیا کہ یہ بھی باقی بزرگ شعراء کی طرح وہی روایتی کلام سنائے گا جس کو سن کر اب میرے کان پک چکے تھے۔ لیکن ان کی غزل کا مطلع سنتے ہی میں حیران رہ گیا۔ مجھے وہ غزل اس وقت یاد نہیں لیکن اس کا تاثر اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ مطلع نہ صرف غیر روایتی تھا بلکہ اس سے اس وقت کی جدیدیت کی بو آ رہی تھی۔ پوری غزل پیچیدہ بیانی کی ایک عمدہ مثال تھی۔ ایسی غزلیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مشاعروں میں عموماً ایسی غزلیں پیش نہیں کی جاتیں۔ سیفی سوپوری نے جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی مزاج اور اسلوب کی یہ پوری غزل پڑھی جس کے وہ مالک تب بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ ایسی غزلیں تب بھی سامعین کے سر کے اوپر سے گذر جاتی تھیں اور آج بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اُردو میں غزلیں روزانہ ٹنوں کے حساب سے لکھی جاتی ہیں۔ یا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان کی recycling کی جاتی ہے۔ انہی مضامین اور موضوعات

(جن کو اساتذہ بہتر انداز اور اسلوب میں پہلے ہی عبرت برت چکے ہیں) کی بازگشت آج کی غزلوں میں سنائی دیتی ہے۔ آج کل کے اکثر شاعر اخباروں میں چھپی خبروں کو خام مواد کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاعری کا حق ادا ہو گیا۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ شاعری کسی طرح بھی کسی علم میں اضافہ نہیں کرتی نہ اس کا کام سامعین کو معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ شاعری سے فرحت وانبساط حاصل ہوتا ہے۔ اچھی اور اہم شاعری صرف قاری کو ان تجربوں میں شریک کرتی ہے جن سے شاعر گزر چکا ہوتا ہے یا قاری کے اندر ان سوئے ہوئے تجربوں کو تازہ کرتی ہے جن سے قاری خود پہلے گزر چکا ہوتا ہے۔ اچھی شاعری ان تجربوں کی بازیافت کرتی ہے۔ شاعری کیلئے بھی کسی یونیورسٹی یا کالج کی اسناد کی ضرورت نہیں۔ کائنات ہر انسان کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ بس اسی کتاب کا مطالعہ شاعر کیلئے ضروری ہے۔ جس شاعر نے اس کتاب کا مطالعہ باریک بینی سے کیا اس کی شاعری اہم قرار پائی۔

جناب سیفی سوپوری صاحب ان شاعروں میں ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ کائنات کی کتاب کا گہرا اور وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی شاعری پڑھ کر ذہن ودل میں ایک روشنی سی پھیل جاتی ہے اور ایسی شاعری

بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ میں جناب سیفی سوپوری کے چند غزلیہ اشعار قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں تا کہ میری بات کا جواز میسر ہو۔

غاروں سے نکلتا ہوا صحرا نظر آیا
دیوار کا ہٹنا تھا کہ دریا نظر آیا

خطاب یوسف کنعاں کامل نہیں سکتا
تلاش حسن میں ہر ایک چاک داماں کو

نیت کے چور تھے کہ ارادوں کے راہزن
کتے سے بھونکتے رہے باہر تمام رات

چشمہ ساروں کے کنارے جلی انگور کی بیل
سوکھ جانے کے لئے لاکھ سمندر آئے

سونگھ لو سبزے کی خوشبو کو ذرا اب سیفی
آسمانوں کی بہت سیر تو تم کر آئے

کیا فصیلیں ہیں نظر آئے کوئی سنگ نہ خشت
کیسے قلعے ہیں نہ دیوار نہ در رکھتے ہیں

رہ میں ابھرے ہوئے بے نام ہمالوں کی قسم
دام بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ستانے کے

میں نے ان اشعار کا انتخاب بغیر کسی تلاش کے مجموعے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایسے خوبصورت اشعار سے بھرا پڑا ہے۔

سیفی سوپوری کے نام اور کام سے اکثر اُردو والے بے خبر ہی رہے۔ اس میں اردو والوں کا قصور نہیں۔ سیفی سوپوری دراصل درویشانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک طرح کی شان بے نیازی ہے جس کی وجہ سے وہ چھپنے چھپانے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے رہے۔ ان کی تخلیقی عمر تقریباً ۷۰ سال کو محیط ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مزاج زمانے کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ انہوں نے بعض روایت پرست شعرا کی طرح بیسویں صدی میں رہ کر انیسویں صدی کی سی شاعری تخلیق نہیں کی۔ انہوں نے اُردو کے اساتذہ کو ضرور پڑھا ہے۔ ان کا تتبع نہیں کیا ہے بلکہ ان سے استفادہ کیا ہے۔

ان کے اولین کلام (جو اس مجموعہ میں شامل ہے) میں فارسی آمیزی زیادہ دکھائی دیتی ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ کم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ فارسی اضافت کا استعمال کر کے انہوں نے بہترین اصطلاحات وتراکیب اختراع کی ہیں جن سے ان کی شاعری میں تخلیقی چمک پیدا ہوگئی ہے۔

وہ زبان کو تخلیقی طور پر استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے کلام میں تہہ داری پیدا ہوگئی ہے۔ سیفی ہمارے ان تمام بزرگ شعراء سے بلکل مختلف ہیں جو ان کے عمر کے ہیں۔ ان کے ہم عمر شعراء مثلاً میر غلام رسول نازکی وغیرہ روایت کو گلے سے لگاتے ہوئے چلتے نظر آرہے ہیں جبکہ سیفی سوپوری کے یہاں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ روایت سے انحراف کا رجحان ملتا ہے۔

سیفی سوپوری کے کلام سے ان کی عروض دانی بھی ظاہر ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ انہوں نے غیر مانوس اور غیر مروجہ طور کا استعمال کر کے روایتی آہنگ سے بھی انحراف کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

اس مجموعے میں کئی نظمیں بھی شامل ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی نظموں کا مزاج بھی جدید ہے۔ پیچیدہ بیانی سیفی سوپوری کے یہاں عیب نہیں بلکہ ایک ہنر کے طور پر ابھرتی ہے۔ پیچیدہ بیانی دراصل ایک

لطیف ابہام کو جنم دیتی ہے اور اسی ابہام کی وجہ سے کلام میں تہہ داری پیدا ہو تی ہے۔ یہ خصوصیت سیفی سوپوری کے کلام میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور ایسی خصوصیت انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز بنا دیتی ہے۔

مجھے فخر ہے کہ انہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو اپنے مجموعہ کلام پر چند سطور لکھنے کیلئے میرا انتخاب کیا۔ میں کوئی نقاد تو نہیں بس اپنے تاثر کو لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ سیفی سوپوری کا یہ مجموعہ ناقدان فن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہوگا۔ یہ بھی امید ہے کہ ''صحرا صحرا'' ادبی اور علمی حلقوں میں وہ پذیرائی حاصل کرے گا جس کا یہ حق دار ہے۔

دعا گوں ہوں کہ سیفی سوپوری کا یہ مجموعہ کلام ایسے کئی مجموعوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

احقر

رفیق راز

باغات، برزلہ سرینگر کشمیر

۱۵ اپریل ۲۰۰۱ء



......بشرف نظر قافلۂ سالارِ ادب والانتقاد

علی جناب شمس الرحمان فاروقی......

صاحب من!

السلام علیکم ورحمۃ

ناچیز سیفیؔ سوپوری خدمت عالیہ میں حاضر ہے۔ عزیز اطہر مسعودی ریسرچ سکالر باٹونی علیگڑہ مسلم یونیورسٹی جناب کے ساتھ رابطہ کرنے میں کامیاب ہوا اور جناب نے ازراہِ لطف وکرم ارشاد فرمایا تھا کہ آپ میری چند غزلوں کا مطالعہ فرمائیں گے اور اپنی رائے گرامی کا اظہار فرمائیں گے میں چاہتا ہوں کہ اس عریضہ کے ذریعے اپنا مختصر تعارف پیش کروں۔ میرا نام سیف الدین ہے اور سیفیؔ تخلص کرتا آیا ہوں۔ میں مسعودی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میری عمر اسوقت ۸۹ سال ہے. میں ساری عمر اردو زبان میں شعر لکھتا آیا ہوں۔ سٹھ باسٹھ سال کے عرصے میں محض اپنی طبیعت کے بھروسے سے شعر لکھتا رہا۔ حالات ایسے رہے کہ مجھے کسی استاد کا سہارا

حاصل کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ لیکن میں برابر لکھتا رہا۔ رسالہ شب وخون میں آپ کے مضامین عالیہ اور انتقادی مضامین سے کسبِ فیض کرتا رہا۔ اردو زبان کی بدقسمتی یہ تھی کی شب خون کا اجرارک گیا۔ میں اردو زبان کی بقا کے حوالے سے اس صدی کو 'شب خون کی صدی' مانتا ہوں جو آپ کی نور ہدایت عالیہ کا مرہون منت تھا۔

میں اس وقت عمر کی آخری سرحد چھو رہا ہوں بصارت سماعت اور سب قوتیں جواب دے رہی ہیں۔ آپ کا لطف وکرم ہے کہ عدیم الفرستی کی انتہا کے باوصف آپ نے میری چند غزلوں کو دیکھنے کی زحمت گوارا کرنے اور عالی قدر رائے کے اظہار کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے۔

۹۰ سال کی عمر میں جلدی قدم رکھنے والا عرض گذار آج بھی اپنی پیاری زبان اردو میں لکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ لیکن ہوں تو غیر اہل زباں اور اہل زبان کی محل میں بار پانے کے لئے دستک دے رہا ہوں۔ میری غزلیں زندگی میں وارد ہونے والے واقعات، احساسات اور واردات کا نتیجہ ہیں۔ مصائب و آلام اور عوارض زمانہ میرے کلام پر چھائے ہوئے ہیں۔ سیاست سے میں نے دور رہنے کی کوشش کی ہے۔ گہرائیوں میں اترنے کا عادی ہوں۔ میرؔ غالبؔ اور دیگر اساتذہ کا تا حد استطاعت مطالعہ کرتا

رہا ہوں اور شب خون کے ذریعے آپ کے ارشادات سے رہنمائی حاصل کرتا رہا ہوں۔

میں فارسی میں بھی لکھتا رہا ہوں حق یہ ہے کہ ابتدا میں نے فارسی ہی سے کی تھی۔ اور پھر اردو کی طرف آیا، اور اردو کا ہی ہو رہا۔ میں ایک پرائمری ٹیچر کی حیثیت سے محکمہ تعلیم میں داخل ہوا اور ۱۹۷۰ء میں بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر ریٹائر ہوا۔

جناب عالی! میں نے اپنا من و عن آپ کے سامنے کھول کے رکھ دیا ہے۔ اپنی چند غزلوں کا انتخاب آپکی خدمت عالیہ میں پیش کر رہا ہوں۔

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ میری پرخلوص دعائیں

عریضہ نیاز
سیفی سوپوری



اِرشاداتِ عالیہ

﴾......جناب شمس الرحمان فاروقی کے قلم سے......﴿

۲۵ دسمبر ۲۰۱۰

برادر بزرگ و مکرم جناب سیفؔی سوپوری،

السلام علیکم

کرم نامہ شرف صدور لایا. بیحد ممنون ہوں اور مبتلائے حیرت ہوں کہ آپ اتنی مدت سے علم و ادب کی دنیا میں گرم عمل اور میں بے خبر رہا. ماشااللہ اس عمر کو پہنچ کر بھی آپ کا تخلیقی التہاب ایسا ہے کہ ہم سب کے لئے باعث رشک ہے۔اور کیوں نہ ہو،آپ ماشااللہ اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ان کی برکتیں کچھ تو شامل حال ہوں گی.از راہ کرم تحریر فرمائیں کہ آپ نے جو تراجم اردو میں انگریزی سے کئے ہیں وہ کہاں سے شائع ہوئے

ہیں تا کہ میں انہیں منگا کر استفادہ کروں۔

افسوس کہ صحت کی خرابی اور فرصت کی سخت کمی کے باعث آپ کے کلام پر اظہار خیال سے معذور ہوں۔اس وقت چند جملے مجملاً اور سرسری لکھتا ہوں۔براہِ کرم انہیں تحفۂ درویش سمجھ کر قبول فرمائیں:

جناب سیفی سوپوری کی غزلیں دیکھکر فوری اثر یہ قائم ہوا ہے کہ یہ کسی پختہ کار، سنجیدہ، لیکن جوان العمر شاعر کا کلام ہے۔جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خالق عمر کی نو دہائیاں پوری کرنے والا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ جب تخلیقی وفوری کا اس وقت یہ عالم ہے تو خدا جانے ایام جوانی میں کیا رنگ رہا ہوگا۔کلام پر کہیں سے بھی سالخوردگی کی پرچھائی نہیں۔کہیں بھی روایتی طرز بیان یا سامنے کے مضامین باندھ کر غزل کو ٹھکانے لگا دینے کی کوشش نہیں۔ شاعر کا لہجہ تھوڑا سا مصلحانہ، تھوڑا سا مفکرانہ،اور تھوڑا سا واعظانہ ہے۔آج کل کا تو حال چھوڑیئے کہ اخبار کی سرخیوں اور ٹی.وی کی نام نہاد ''حقیقت پسندی'' پر مبنی

کہانیوں کو کھرچ کر، کچھ کانٹ چھانٹ کر شعر بنا لینا عام ہے لیکن پہلے بھی، جب شعر کہنے کے لئے واقعی قوت تخیل اور قوت فکر کو کام میں لانا ضروری تھا، سیفی سوپوری امتیازی شان سے خالی نہ ہوتے۔

سیفی سوپوری کی لفظیات میں اقبال کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن یہ جھلک تقلید کی بنا پر نہیں، بلکہ اقبال کے شعر کا آہنگ شاعر کی تخلیقی قوتوں سے یکجان ہوگیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ سیفی سوپوری کی غزلوں کا مجموعہ جلد شائع ہوکر سرمۂ اہل نظر کا درجہ حاصل کرے گا۔

شمس الرحمان فاروقی



ترتیب

۱۵۔ ادا ادا سے جھلک تیرے بانکپن کی سی
۱۶۔ جھیل ڈل اور چاندنی رات
۱۷۔ تم ہی آئے ، نہ گلستاں میں بہار آئی ہے
۱۸۔ تیری محفل میں حریف دل و جاں تھے پہلے
۱۹۔ دل ہے سینے میں کہ پہلو میں دہکتی منقل
۲۰۔ آندھی وہ چلی آج کہ بدلی ہے فضا بھی
۲۱۔ وہ بہاروں کا اک نگر ہے میاں
۲۲۔ سقراط عدالت کے کٹہرے میں
۲۳۔ ہر شام کی آغوش میں کھلتے نہیں شبو
۲۴۔ بے خیالی میں سہی سخت چلا ہے پتھر
۲۵۔ پہلو میں تمنا کے بہاروں کا خدا تھا
۲۶۔ پھیلتا سہرا ہے آخر تو کہاں تک جائے گا
۲۷۔ اب اس طرح نہ دیکھ زمیں سے اُٹھا مجھے
۲۸۔ اس گلبدن کی کھوج میں جو خار و خس گیا
۲۹۔ اس سلگتے ہوئے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے
۳۰۔ خواب میں ٹوٹے ہوئے پُل سے گزرتا دریا

۳۱۔ مسافر

۳۲۔ یہ تو معلوم ہے ، پتھر کے نہیں ہوتے گلو

۳۳۔ باد صبا میں کس گل تر کا اثر لگے

۳۴۔ گلوں کا بانکپن دیکھیں گریبان سمن دیکھیں

۳۵۔ گل مہکتے ہیں ، فضا راگ سنانے آئے

۳۶۔ تاریخ وفات پدر بزرگوار

۳۷۔ برق

۳۸۔ دل کا موتی بھی سنگریزہ صاف

۳۹۔ تو میری مان، دل کو غلط آسرا نہ دے

۴۰۔ ادا ادا سے دلوں پہ نازل ہوئے قرینے

۴۱۔ شب کے پردے میں چھپا لوٹ لیا گھر میرا

۴۲۔ دیکھتا رہتا ہے کیا نقش کف پا کی طرف

۴۳۔ یہ سنگ آئینۂ اعتبار کی جانب

۴۴۔ دیکھنا ہے کہ یہ موسم ہیں سہانے کتنے

۴۵۔ دیار فکر سے امکان کا گزر ہوگا

۴۶۔ راستہ درد کے سہرا کا دکھا دے مجھ کو

۶۳۔ بس ایک جست میں تہ کردیا بیاباں کو

۶۴۔ نکھرے جو نقش دل کے اُفق پر تمام رات

۶۵۔ پھر صبح تبسّم میں بھی کیا مات نہیں تھی

۶۶۔ لوٹ کر بت سے جو اُچھلے سبھی کنکر آئے

۶۷۔ تری نگاہ کا روکے رہا حصار تُجھے

۶۸۔ دیار سنگ میں گونجا ہوا ترانہ تھا

۶۹۔ دیکھ، سفر آئینہ، غبار نہیں ہے

۷۰۔ کوئی گہری کوئی گمبھیر کمک پہنچے تو

۷۱۔ ناسور ہے کتے نے جہاں کاٹ لیا ہے

۷۲۔ آہو

۷۳۔ ہر گل کو بے نیازیٔ صحرا کا احترام

۷۴۔ صبا آئینے سحر سامری سے کم نہیں ہیں

۷۵۔ اُفق اُفق سے پتا آندھیاں اُبھرنے کا

۷۶۔ خدا حافظ

۷۷۔ گزرتے لمحوں کے منہ سے نکلا سحر مثالی

۷۸۔ وہ سبز ہیرا جو میں نے وقت سحر نہ پایا

۷۹۔ وہ لمحہ کہ آئینے کو آتا ہے خدا یاد

۸۰۔ دل اس نگری میں جلتے رہنے کا ساماں تو ہوگا

۸۱۔ ترا خیال زمانہ پڑھے بغیر رہے گا

۸۲۔ تھرکتی لاشوں پہ اُڑتے رہے غُراب یہاں

۸۳۔ سیاہ رات تھی روشن کوئی دیا بھی نہ تھا

۸۴۔ جب رات سبھا میں تاروں کی

۸۵۔ مسافتیں ہوئی جاتی ہیں انتہا کے قریب

۸۶۔ چھپ چھپ گئی ہے کیسی بہاروں میں چاند رات

۸۷۔ کیسے طوفانوں کا ہے گھر سینے میں

۸۸۔ یہ دیوار سے کس کے شانے لگے ہیں

۸۹۔ تنہائیوں کو وسعت صحرا کا پیار دے

۹۰۔ کس کی جانب کوئی بازوئے شناور کھولے

۹۱۔ سنگ پر کیا نام تھا زرتاب معیاروں کے ساتھ

۹۲۔ ہاں گذرتا ہے اسی راہ سے فانی کوئی

۹۳۔ مسکراہٹ کے فریب آنسوں کے دھوکے سارے

۹۴۔ زندگی دریائے خوں سے تیر کر آنا پڑا

۹۵۔ تو ہی بتا کہ راہ میں کیسے ہو روشنی

۹۶۔ عکس بجلی ہے، لپک جائے گا آئینے سنبھل

۹۷۔ اب صبا جاکر خبر لے آئے دریا پار سے

۹۸۔ ہر کھڑکی ہے ٹوٹی ہوئی سورج کے مکاں کی

۹۹۔ جنگلوں ہی کی خبر تھی ،نہ پتہ کھائی کا

۱۰۰۔ دل و نگاہ کو رکھ لیجئے زباں سے الگ

۱۰۱۔ تاریک جہانوں سے کوئی تازہ سفر تھا

۱۰۲۔ آپ اور میں تھے فقط میرے خدا صحرا میں

۱۰۳۔ کون پُل توڑ کے موجوں کو جگا دیتے ہیں

۱۰۴۔ کن بچھڑی گلیوں میں اکیلا سانجھ سویرے جائے

۱۰۵۔ بچھڑ کے رہ گئے دریائے بیکراں ڈوبے

۱۰۶۔ بیگانہ نگاہوں میں سنورنے کی ادا کیوں

۱۰۷۔ آنکھ اُٹھانے کی سزا دیتے ہیں

۱۰۸۔ اندھیارا ہر سمت رواں ہے آنکھیں کھول کے چلنا

۱۰۹۔ ہاں یقیں ہے، کہ مرے فرط گماں سے اُبھرا

۱۱۰۔ میں نے اس شمع کو بجھنے نہ دیا

۱۱۱۔ جل اٹھے پھول کہ پھیلا کئے صحرا لوگو

۱۱۲۔ شمع کی طرح بجھاتا ہے ، خدا جانے کیوں

۱۱۳۔ آئینے کے پردے میں اگر ہم نہیں ہوتے

۱۱۴۔ شاخوں پہ نظر آئے تھے دمساز بہت کم

۱۱۵۔ یہ مہکتا ہوا دریا گزراں ہے کہ وہی ہے

۱۱۶۔ تصویر

۱۱۷۔ پھول جو دل نے چھپایا ہے جانا پہچانا ہے

۱۱۸۔ ہانپ رہا ہوں کانٹے ہیں پاؤں میں

۱۱۹۔ دل کا سکوں ، چاند رات ، آب رواں ہے

۱۲۰۔ کوئی مفہوم نہ شب کا ہوگا

۱۲۱۔ اشک موضوع مری تنہائی کا

۱۲۲۔ خدا کرے نہ سفینوں کا کارواں ٹوٹے

۱۲۳۔ میرے دشت کا جو غزال ہے

۱۲۴۔ نہ راہوں سے کوئی لوٹا نہ پل بھر نیند آئی

۱۲۵۔ حسن کا معیار کُھلتی سادگی ہے یاد رکھ

۱۲۶۔ عکس بجلی ہے لپک جائے گا آئینے سنبھل

۱۲۷۔ تم کو تو وہ دن یاد ہے ۔ آغاز سفر تھا

۱۲۸۔ ماتھے پہ نمودار لکیریں نہ جتانا

۱۲۹۔ مہک !

۱۳۰۔ نگاہ کا کبھی پرچم کھلا ہے نافہ قبیل

۱۳۱۔ صحرا صحرا !

۱۳۲۔ کشش ، طلب کا ترنم ہے ، آبشاروں میں

۱۳۳۔ نہایت اسکی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

۱۳۴۔ بیلیں۔۔۔

۱۳۵۔ آئینہ بھی ہے ، گلاب بھی ہے

۱۳۶۔ یہ سرد ، لمبی ، سکوں سے عاری سیاہ راتیں

۱۳۷۔ مت جان ، ارادے کی خطا کم سخنی ہے

۱۳۸۔ پھولوں کا حسیں شہر ہے چپ چاپ گزر جا

۱۳۹۔ پھول صحرا کو بہاروں کا خدا ہی دے گا

۱۴۰۔ نقش بر سنگ ہے افسانہ ، خموشی تجھکو

۱۴۱۔ بیستوں کاٹنے سے پیار کیا

۱۴۲۔ بید سایہ گل آئینہ ہوگا

۱۴۳۔ بیل ہے انگور کی دریا رواں ہے

۱۴۴۔ یوں نگاہوں سے کئی سرو رواں گزرے ہیں

۱۴۵۔ شبیہوں پر مسلط تیرگی ، بے آسرا ہے

۱۴۶۔ دور کی باتیں

۱۴۷۔ پروں کو شوخ نگاہوں کا حوصلہ دینا

۱۴۸۔ اسی خرابے میں دیکھنا اپنی شام ہوگی

۱۴۹۔ کھلتی گئی تصویر ہوئے چشم کُشا راز

۱۵۰۔ سلگتے دشت سے باد صبا بھی چلتی ہے

۱۵۱۔ آ خوشبو

۱۵۲۔ نگہ نگہ میں تُلے حسن انتخاب مرے

۱۵۳۔ چھڑ گئی بات زمانے میں اکیلے پن کی

۱۵۴۔ صحرا ہی میں گزری ہے کبھی گھر نہ گئے ہم

۱۵۵۔ جب دُھواں سا کسی کونے سے نمایاں ہوتا ہے

۱۵۶۔ سفینہ ہوں، رواں دریا، اُٹھا چکا ہے مجھے

۱۵۷۔ گرد صحرا ہے ، کسک درد کے ماروں کی ہے

۱۵۸۔ خوشبو ہے صبا ، درد کے صحرا میں حنا کی

۱۵۹۔ تو گل اچھال کے خوشبو بکھر بھی جاتے ہیں

۱۶۰۔ نذر غالبؔ

۱۶۱۔ اصیل نافہ ، فصیلوں پہ پہرے دار ہوا شب

۱۶۲۔ آج تک چشمِ فلک سوچے نہ جانے کیا کیا

۱۶۳۔ جینے کا یوں حساب کریں کیا خیال ہے

۱۶۴۔ خنجر میں ہوگیا وہ روپوش بے سبب

۱۶۵۔ شہد جنگل سے جو آیا تھا ، نکھارا سارا

۱۶۶۔ شہر کا شہر تو جاگ رہا تھا

۱۶۷۔ اپنے شاہد ہیں مقدر کی خبر رکھتے ہیں

۱۶۸۔ گئے لمحے تو کبھی لوٹ نہیں آنے کے

۱۶۹۔ نذر میرؔ

۱۷۰۔ موجوں سے بات ہو تو نظر بادباں پہ رکھ

۱۷۱۔ کتنا ظالم ہے لڑنے کو آیا تو

۱۷۲۔ رنگ دانش کا بھی چڑھ سکتا ہے نامعقول پر

۱۷۳۔ کہاں کہاں تھے چھپے اشتہار دیکھ لیا ہے

۱۷۴۔ اس عہد میں دل کا سکوں کیسے ہوا نایاب سا

۱۷۵۔ دیار فکر سے امکان بہرہور ہوگا

۱۷۶۔ دھندچھٹ جائے ،علامات سے کیا ہوتا ہے

۱۷۷۔ لبادے اوڑھ کے پھرتے رہوگے یوں کب تک

۱۷۸۔ آگے راہ گذر انجانا آتا ہے

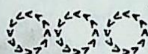
۱۷۹۔ گہرائی سے رنگ اڑاکر صورت سازی کرتے ہیں

۱۸۰۔ اب آو ڈل میں اگائیں اک اور نیل کمل

۱۸۱۔ ہرگل کو بے نیازی صحرا کا احترام

۱۸۲۔ لمحۂ حسن طلب کیا بار با آیا نہیں

۱۸۳۔ خموشی سفر ساز و آواز تک



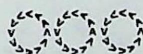
نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

گُہر اثر مرے ادراک آگہی میں ابھر
کریں نثار شہ انبیاءؐ پہ سبدِ گہر
جو میری آنکھ ہے خُوننابہ بار شایاں ہے
جھکا نہ آجتک میرا در حبیب پہ سر
حبیب وہ کہ حبیبِ خدا جسے کہئے
شفیع وہ کہ شفاعت کرے سر محشر
اُٹھے تو عرش کے تارے بھی خم کریں گردن
چلے تو حضرت جبریل بھی جھکائے سر
حسین جس سے زیادہ نہ آنکھ نے دیکھا
جمیل جس سے فزوں تر نہ جن سکی مادر
ہرایک عیب سے خالی ہے ذات پاک اللہ!
کہ جیسے آپ ہوں خود اپنی خواہشوں کا ثمر
حسیب جس کا نہ ٹوٹا کبھی کوئی پیماں

لبیب جس کی نظر ماورائے حدِ بشر
وہ حرف حرف کو جس نے فصاحتیں بخشیں
وہ فقرہ فقرہ ہے جس کا بلاغتوں میں سمر
وہ جس کا نام مصائب کی آندھیوں میں حصار
درود جس پہ ۔ کوئی ابتلا ہو ۔ میری سپر
وہ جوئبار کہ سیراب عالمیں جس سے
وہ جس کے سائے میں آساں قیامتوں کا سفر
نگہ اٹھے تو کھلیں پھول ریگزاروں میں
جو لب کھلیں تو صبا کو ملے ختن کی سحر
وہ شہسوار جلوگیر جن کے تھے جبریل
وہ عبدہٗ کہ سرِ عرش جن کی راہ گزر
وہ جس کے واسطے کون و مکان ہوئے پیدا
وہ جس سے کرتے رہیں کسب نور شمس و قمر
شبیہہ برق ہے بازوئے حیدری کی لپک
حصار حفظ ہے تیری نگاہ کا مغفر
مرے مُنیب ، مجھے اپنی خاک راہ میں پا

مری نظر میں نہیں اس سے مرتبہ برتر
وہ تو ہے قلب و نظر کو جہاں پناہ ملے
وہ تو نگاہِ تجسّس جہاں چھپائے سر
نگاہ میں رہے مولا ، سفینہ امت کا
ہے جس نگاہ سے ہر موج تند خُو کو حذر
عجب ہی کیا ہے کہ آجائے بر کرم آقا
بعید کیا کہ سر حشر پاؤں شرفِ نظر
وہ جس کے تاجِ نبوت میں طرّہ طٰہٰ
وہ جس کی راہ میں یٰسیں کی تابناک سحر

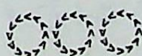
وہ جس کے نام پہ سیفیؔ فدا مرا سب کچھ
وہ جس کا داغِ غلامی ہے میرے ماتھے پر



......خواجہ کی خوشبو کی نگری......

جس خوشبو کی نگری میں سائیں رہتا ہے
مجھکو بھی تو وہیں جانا ہے
میرے سنگ چلو تو اچھا
ہاں تو میں تم سے کہنے لگا تھا
کالے کوسوں
میں تو دور چلا آیا ہوں
بات تو یہ ہے
مجھکو
گھر کے آنگن سے چلتے ہی
داہنے ہاتھ کو مڑ جانا تھا
وہیں جانا تھا
جس خوشبو کی نگری میں میرا سائیں رہتا آیا ہے
میں جاگا تو
اپنے آپ کو یخ بستہ چوٹی پر دیکھا

جانے کہاں پر پاؤں پھسلا
ٹھٹھر گیا ہوں
سنگلاخوں سے چلتے چلتے
پاؤں لہو لہاں ہیں میرے
ہاں ---
صحرا کی آگ میں جل کر
راکھ ہوا ہوں
لیکن اب تو ---
میری کشتی تیز ہوا میں، برق وباد کے طوفانوں میں
لہر لہر کے تھپیڑے کھاکر
اب ساحل سے آن لگی ہے
ٹھہرو ---
مجھکو تھامو ،سنگ سنگ، چلیں تو اچھا ---
میں نے بھی تو وہیں جانا ہے
جس خوشبو کی نگری میں میرا سائیں رہتا ہے ---



نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

صحراؤں سے پھوٹتا ۔ ٹھنڈا شیریں چشمہ
عالم عالم کی سیرابی
پیاسے ۔ کتنے دور ہو اس سے

تو بے جاں ہے ۔ وہ تجھکو جان بخشدے گا
تو گونگا ہے ۔ تجھکو زبان بخشدے گا
زباں مل گئی تو ۔ بیاں زندگی ہے، بیاں آدمیّت کی پہچان ہے
شرف آدمی کا ہے ۔ وہ تو جلا دے کے آئینے کو
تجھے حُسنِ بیاں بخشدے گا

کہاں تک بھٹکتے پھروگے ۔ یہی راستہ ہے
کبھی اس کا شیرین پانی تو پی لو ۔ زمیں سے اٹھا کر
تجھے رفعت آسماں بخشدے گا
یہ اندھیارے مٹ جائینگے ۔ روشنی آئیگی



طنزیہ

ایک ساغر کے لئے سارا جہاں لے لیجئے
دین وایماں جان ودل کون ومکاں لے لیجئے

تحفہ دل گو نہیں ہے درخورِ نظر قبول
مفت ملتا ہے تو اے آرام جاں لے لیجئے

اس قدر شوقِ شہادت گدُگدُاتا ہے مجھے
جی میں آتا ہے خود اپنا امتحاں لے لیجئے

کرکری ہوجائیں ساری شیخیاں ایسا نہ ہو
چپکے چپکے ہی ہمارا امتحاں لے لیجئے

آپ کی ہر ہر ادا پر جاں سے قربان ہُوں
آپ کو باور نہ ہو تو امتحاں لے لیجئے

کینہ دل میں بجز آہ وفغاں کچھ بھی نہیں
جس قدر درکار ہو آہ وفغاں لے لیجئے

نام پیدا کیجئے خدمت کوئی کر جایئے
قوم پر مرکر حیاتِ جاوداں لے لیجئے

سیفیاؔ تار رباب زندگی کو چھیڑ کر
مُول کیوں ناحق نزاع مردگاں لے لیجئے

خوب سوجاؤ ، خدا یاد رہے یا نہ رہے
گرمیٔ روز جزا یاد رہے یا نہ رہے

حشر تک برق جہانسوز رہے گی بدنام
نوحہ خواں بلبل ناشاد رہے یانہ رہے

نوکِ خنجر کو دیا جائے گا نیروئے بیاں
لب پہ مظلوم کے فریاد رہے یانہ رہے

تمکو اے بندۂ زر اور کسی کا کیا غم
اہل دنیا میں کوئی شاد رہے یا نہ رہے

میرے احباب مری قبر پہ آئیں گے ضرور
آج کل انکو مری یاد رہے یانہ رہے

ڈگمگائیں گے نہ ہم راہ وفا میں ہرگز
آپ کو عہد وفا یاد رہے یانہ رہے

ہم تو مرنے کے لئے سینہ سپر ہیں سیفیؔ
تاک میں خنجر بیداد رہے یانہ رہے





غم و آلام سے پُر عالم اسباب ہے ساقی
سکوں نایاب ہے ساقی مسرت خواب ہے ساقی

یہ کیا اندھیر ہے کوئی تو پانی کو ترستا ہے
کسی کے ہاتھ میں جامِ شراب ناب ہے ساقی

خدا جانے یہ کس معصوم کا خرمن جلا ڈالے
فلک پہ شعلۂ برق تپاں بیتاب ہے ساقی

جوانی آرزوئے حُسن سے بیتاب ہو جائے
کتاب سرفروشی کا یہ پہلا باب ہے ساقی

قمر کی آبرو بے آبروئی کی علامت ہے
رہینِ منت خورشید عالمتاب ہے ساقی

ہم آزادی کی خاطر جان تک قربان کردیں گے
کمربستہ ہمارا حلقۂ احباب ہے ساقی ۱۹۶۶ء

اِدھر افلاس کی کٹیا میں کانٹوں کا بچھونا ہے
اُدھر قصرِ امارت میں بچھا سنجاب ہے ساقی

ہمیں سوئے ہوئے دہقان کو بیدار کرنا ہے
بڑی مدت سے بیچارہ رہینِ خواب ہے ساقی

کسی کی موہنی صورت کو جب سے دیکھ پایا ہے
دل بیتاب رشکِ قطرۂ سیماب ہے ساقی

جو سیفؔی آہ مسلا جا رہا ہے صحن گلشن میں
گلستان جوانی کا گل شاداب ہے ساقی





فدا جن پہ ہوں آسماں کے ستارے
نگاہوں میں ایسے بھی ہیں ماہ پارے

بھلا آدمی کیا نہیں کرسکے گا
مگر شرط یہ ہے کہ ہمت نہ ہارے

انھیں بھی الجھنا ہے طوفاں سے اک دن
چلے آئے ہیں جو کنارے کنارے

ہے سرمایۂ زندگی یاد ان کی
جو لمحے ترے ساتھ ہم نے گزارے

کبھی جو تھے ساری خدائی کے پیارے
وہ خورشید وش بھی عدم کو سدھارے

مخالف ہواؤں کو جاکر خبر دو
مرے ساتھ ہیں وقت کے تیز دھارے

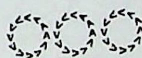
بساط محبت پہ ہشیار سیفیؔ
جو اک بار جیتے تو سو بار ہارے

فاصلے

شمع کی مانند جلتا ہوں مگر خاموش ہوں
چشمِ تر سے اشک حسرت ہیں رواں
جانتا ہوں میں کہ تم نزدیک ہو کر دور ہو
اور حائل ہیں ہمارے درمیاں وہ مشکلات
جن کا حل شاید کسی تدبیر سے ممکن نہیں
آہ --- اپنی بے بسی کو دیکھکر
غرق ہو جاتا ہوں بحرِ یاس میں!

پھر بھی جیسے گھپ اندھیری رات میں
برق کا شعلہ چمک جائے، ذرا سی دیر کو
اور تھوڑی دور سطحِ آب پر آئے نظر
ایک منظر دلفریب:

ناؤ میں بیٹھی ہوئی اک نازنین
جانے کہاں جاتی ہوئی؛
چارسُو بکھرے ہوئے پانی میں لہراتے کنول،
اور یہ نظارۂ رنگیں چھپے
دفعتاً پھر رات کی ظلمات میں ـــ اے دلربا
جب کبھی تم سے ملاتا ہوں نگاہ
ایک جلوہ دیکھتا ہوں اس سہانے خواب کا
جس کی رنگینی ہے رشکِ نزہتِ باغِ جناں ـــ
اور پھر،
غرق ہو جاتا ہوں بحرِ یاس میں!!!





تیرے عارض کی چمک حسن بہاراں جیسے
لب لعلیں کا تبسّم گُل خنداں جیسے

میرا دل میرے خیالات کی دنیائے حسیں
موسم گل میں کوئی صحنِ گلستاں جیسے

سر اُٹھاتی ہے تری یاد کبھی یوں دل میں
یک بہ یک جاگ اٹھے شمع شبستاں جیسے

وادئ غم سے دل زار چلا ہے صد چاک
خار زاروں سے اُلجھتا ہوا داماں جیسے

لمحہ بھر کے لئے اُٹھی وہ نگاہ دلدوز
لمحہ بھر رُک ہی گئی گردش دوراں جیسے

شمع دل یاس کی دُنیا میں لرز اُٹھی ہے
آندھیوں میں ہو، چراغ تہ داماں جیسے

مسکراتا ہوا گذرا ہے یہاں سے سیفی
دل کے نکلے ہوں، نہ نکلے ہوئے ارماں جیسے

اذاں

دمبدم توحید کے نغمے سناتی ہے اذاں
غیر کی طاعت سے بندوں کو چھڑاتی ہے اذاں
ہر تمرّد کیش کی گردن جھکاتی ہے اذاں
نقشِ ہیبت لوحِ دل پر چھوڑ جاتی ہے اذاں
گنبد افلاک میں ہر چار سو ہوکر بلند
راہ پر بھٹکے ہوئے راہی کو لاتی ہے اذاں
دہر کے فرمانرواؤں سے بغاوت کا پیام
قہر سے دیوِ غلامی کو بھگاتی ہے اذاں
بندۂ حق کے لئے معراج ہے گویا نماز
اور اس معراج کی جانب بلاتی ہے اذاں
امتیازِ ناروا کو دور کرنے کے لئے
ظلم و استبداد کے ایواں گراتی ہے اذاں
لرزہ بر اندام ہوجاتے ہیں سب جھوٹے خدا
سینۂ باطل کو سیفی چیر جاتی ہے اذاں



رُکی رُکی سی چمن کی بہار ہے آجا
کلی کلی کو ترا انتظار ہے آجا

جگر کباب ہے، سینہ فگار ہے آجا
شکستہ دامن صبر و قرار ہے آجا

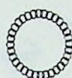
گلوں نے چھوڑ دیا ہے چمن میں اب ہنسنا
نسیم تیرے لئے بے قرار ہے آجا

چمن کے نغمہ سرا آج وقف شیون ہیں
رہین آہ و فغاں آبشار ہے آجا

تمہارے دل میں تمنائے سیر گلشن تھی
کھلے ہیں پھول بہر سو بہار ہے آجا

تمہارے ساتھ گئی ہیں مری تمنائیں
دل آرزوں کا اپنی مزار ہے آجا

ترا شکستہ دل سیفیؔ بانتہائے الم
ترے فراق میں خونابہ بار ہے آجا



خامشی میری باندازِ فغاں ہے کہ نہیں
دل کی ہر بات نگاہوں سے عیاں ہے کہ نہیں

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی مہکتی تحریر
ایک منہ بولتا منشور اماں ہے کہ نہیں

آپ اس طرح سے بولے تھے کہ میں پا نہ سکا
آپ کے منہ سے نکلتی ہوئی ہاں ہے کہ نہیں

جس کو کہتے ہیں تری یاد وہ برقِ جانسوز
جاگتے سوتے مری روح و رواں ہے کہ نہیں

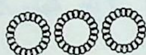
دل کی اک بات جو ہونٹوں پہ کبھی آ نہ سکی
تیری دزدیدہ نگاہوں سے عیاں ہے کہ نہیں

پھونک ڈالا تھا کبھی جس نے مرے دل کا سکوں
اب وہ آتش بجگر، شعلہ بجاں ہے کہ نہیں

ہائے وہ جلوہ کہ جس کے لئے بیتاب ہے دل
آج بھی میری نگاہوں سے نہاں ہے کہ نہیں

جذبہ الفت کا اثر دیکھ زمانے گزرے
آج اس شوخ کے انداز میں ہاں ہے کہ نہیں

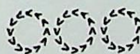
شمعِ اُمید سے سیفؔی یہ ضیا قائم ہے
ورنہ تاریک مرے دل کا جہاں ہے کہ نہیں

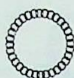




وہ نگاہ اُٹھی ، مرا حسن بیاں ہو جیسے
نغمۂ درد سر تارِ فغاں ہو جیسے
برگ گل پر سے اسی طرح گزرتی ہے نسیم
ترے ہونٹوں پہ تبسّم گزراں ہو جیسے
حسن الفاظ کے سانچے میں ابھی ڈھل نہ سکا
جلوہ آرا ہے مگر پھر بھی نہاں ہو جیسے
میرے پہلو کا کبھی یوں بھی ستارہ چمکا
میرے ہی خواب کی تعبیر عیاں ہو جیسے
مجھکو جاتے ہوئے دیکھا تو یہ محسوس ہوا
اُن کی خاموش نگاہوں پہ کہاں ہو جیسے

دل کو تڑپاتا ہے انداز غزل سیفیؔ کا
یہ سخن سنج کوئی اہل زُباں ہو جیسے

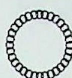




کھل رہا ہے صحرا میں گل ہے لا جرم تنہا
ڈھل رہے ہیں آئینے' جل رہے ہیں ہم تنہا
انجمن میں رہ کر بھی' انجمن سے بیگانہ
زندگی گزاری ہے میں نے بیش و کم تنہا
نقش پا پکار اُٹھے میں کہاں سے گزرا ہوں
رہ سکی نہ دُنیا سے لغزش قدم تنہا
زندگی کی راہوں میں کون کس کا ہوتا ہے
لے کے جا رہا ہوں میں اپنا بارِ غم تنہا
جب کبھی بہاروں میں چاندنی مہکتی ہے
تجھکو یاد کرتے ہیں دو جہاں سے ہم تنہا

درد کیسے جاگا ہے' شام کیوں مہکتی ہے
کس کی یاد میں سیفی ہوں بچشمِ نم تنہا





ادا ادا سے جھلک تیرے بانکپن کی سی
فضا خیال کی آغوش میں چمن کی سی

یہی ہے جنت فردوس تو قبول مجھے
یہاں کی آب وہوا ہے مرے وطن کی سی

یہ کیا سبب، کہ سارا چمن ہے تیرا حریف
کوئی تو بات ہوئی سرو کی سمن کی سی

اسی گلی سے یقیناً غزال گزرے ہیں
نہیں تو آئی کہاں سے ہوا ختن کی سی

غزل سرا ہے کہاں سے یہ دل جلا سیفیؔ
صبا کے نام ہے خوشبو دیار فن کی سی



جھیل ڈل اور چاندنی رات

چاندنی رات ہے اور ڈل کی فضائیں خاموش
بارشِ نور یہاں وقفِ سکوں زائی ہے
جانتا ہے کہ گزرنا ہے مجھے جنت سے
ماہ آئینہ لئے محو خود آرائی ہے

یا تمناؤں کے سرگم پہ کوئی حورِ بہشت
گنگناتی ہوئی دھرتی پہ اتر آئی ہے
کوئی دوشیزۂ کشمیر حیا کی تصویر
آئینہ دیکھ کے گھبرائی ہے شرمائی ہے

چاندنی رات کے ضو پاش فضاؤں پہ سوار
عظمت روح جہانگیر چلی آئی ہے
ڈل کے پانی میں نہانے کے لئے نور جہاں
چاند کے روپ میں کشمیر چلی آئی ہے

یا شہنشاہ فلک نور کا پرچم تھامے
حسن کی کھوج میں کشمیر چلا آیا ہے
ٹانکنے کے لئے تاروں کو جبین ڈل پر
نذر کے واسطے مہتاب اٹھا لایا ہے

ہیں کنول سر کو اٹھائے ہوئے یا جل پریاں
روپ دھارے ہوئے معصوم تمناؤں کا
آسماں تاب ستاروں سے مقابل ہونے
ڈل کے آئینے میں منہ دیکھ رہی ہیں اپنا

سیمگوں سطح پہ زر تاب شکارے ہیں رواں
وادیٔ شب میں سحر جلوہ کناں ہو جیسے
یوں چلے آتے ہیں بجروں میں حسینوں کے ہجوم
قلوبطرہ کا سفینہ گزراں ہو جیسے

کبھی چھپ جاتا ہے اک برق ادا کی مانند
بدلیوں میں سے کبھی چاند نکل آتا ہے
کبھی تاریک سی ہو جاتی ہے ڈل کی دنیا
کبھی شعلہ سا نگاہوں میں لپک جاتا ہے

جانب شرق ذرا دور اسیرِ ساحل؛
کتنے خاموش ہیں زرتاب شکارے ڈل کے
بید زاروں کی سکوں بیز فضا میں شاید
نیند آئی ہے زمانے کو کنارے ڈل کے

جگمگاتے ہوئے بوٹوں کے نہاں خانوں میں
ساز بجتے ہیں تمناؤں کے ارمانوں کے
ڈل کی موجوں سے ہے سرگرمِ تکلّم مہتاب
راز افشاں ہوئے جاتے ہیں طرب خانوں کے

اب یہاں رعب جمانے کے لئے راہوں پر
کوئی پردیس کی شاہی نہیں انگریز نہیں
اب تو فرہاد کی آغوش ہے اور شیریں ہے
ان کے مابین کہیں سطوت پرویز نہیں

سطحِ سیمیں پہ کہیں بید کے سائے ہیں دراز
کسی مہوش کے کھلے شانوں پہ گیسو جیسے
اوٹ میں دور نہاتی ہیں وہ دوشیزائیں
مرغزاروں میں لپکتے ہوئے آہو جیسے

وہ نکلتی ہے کوئی ماہ جبیں پانی سے
لڑکھڑاتا ہے کہیں ڈوب نہ جائے مہتاب
دیکھنا، راہ کہیں بھول نہ جائے جبریل
سینۂ ڈل سے ابھرتا ہے ثریا کا جواب

شالہ ماروں کا نشیمن ہے، نسیموں کا وطن
سایہ افگن ہیں بہاروں پہ جہاں سرو و چنار
چاندنی راتوں میں بن جاتے ہیں عنوانِ بہشت
ڈل کے شاداب کنارے ہیں تقدس بکنار

جگمگا اُٹھی ہے وادی کی حسیں پہنائی
خواب گاہوں سے شب ماہ گذر آئی ہے
اب تو خورشید چمکتا ہے، فضا روشن ہے
میرے کشمیر کے گلشن میں سحر آئی ہے

(موضوعی مشاعرہ ۱۴ ستمبر ۱۹۵۹ء)

(پہلا انعام)

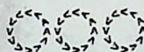


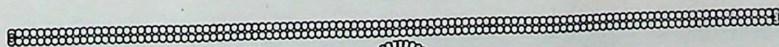


تم ہی آئے، نہ گلستاں میں بہار آئی ہے
میں ہوں میرا دل پر درد ہے، تنہائی ہے
تُو کسی پھول کے سائے میں تو پوشیدہ نہیں
میرے کانوں میں کہاں سے یہ صدا آئی ہے
جھانکتا رہتا ہے راتوں کو دریچے سے تجھے
یہ تو معلوم نہ تھا چاند بھی سودائی ہے
پھول کھلتے ہیں جہاں میری نظر پڑتی ہے
مجھکو اک جانِ بہاراں سے شناسائی ہے
دیکھتی رہتی ہیں میرے دل ویراں کی طرف
جانے کیا بات بہاروں کو نظر آئی ہے
لاکھ طوفان اُمڈ آئیں بھنور منہ کھولیں
ہم نے اُس پار اُترنے کی قسم کھائی ہے

اس بیاباں سے نکلنے کی کوئی راہ بھی ہے
زندگی ہم کو خدا جانے کہاں لائی ہے
کس نے پائی ہے یہاں منزل مقصود کبھی
اپنی قسمت میں اگر بادیہ پیمائی ہے

راہ تاریک ہے، ہم کس کو پکاریں سیفی
گہرا سناٹا ہے تنہائی سی تنہائی ہے







تیری محفل میں حریف دل و جاں تھے پہلے
ہم بھی خاکِ رہ صاحب نظراں تھے پہلے

ہم بیابانوں میں کرتے تھے بہاروں کوتلاش
اب یہ کیا پوچھ رہے ہوکہ کہاں تھے پہلے

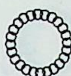
پھیلتی جاتی ہے ہر بسمت گھنی خاموشی
پھر وہیں آ گئے ہم لوگ جہاں تھے پہلے

آپ کو یاد ہماری تو نہ آئی ہوگی
آپ تو محو حدیث دگراں تھے پہلے

سنگریزوں کے عوض ہم سر بازار بکے؛
صورت لعل بدخشاں جو گراں تھے پہلے

یاد آتا ہے کہ دل کیسے مچل جاتے تھے
آپ سے کیا کہیں ہم کیسے جواں تھے پہلے

اب کہاں اگلی شرافت کے نمونے سیفیؔ
مٹتے جاتے ہیں جہاں بھی یہ نشاں تھے پہلے



دل ہے سینے میں کہ پہلو میں دہکتی منقل
اپنے ہاتھوں مرے ہونٹوں سے لگادے چھاگل

میں تو دیوانہ ہوں خاموش نہیں رہ سکتا
تیری آنکھوں سے مگر پھیل گیا کیوں کاجل

کیسے گلشن سے گزرنا ہے تجھے باد صبا
تو جو کوثر سے چلی آئی ہے دھوکر آنچل

راہ یخ بستہ ہے چوٹی ہے تمنا کی بلند
پاؤں پھسلے نہ ترا اور سنبھل اور سنبھل

ریگزاروں میں کوئی پھول کھلے تو کیونکر
کہ گزر جاتے ہیں بن برسے یہاں سے بادل

ایک تم ہو کہ کبھی ہونٹ تمہارے نہ ہلے
میرے نالوں سے یہاں گونج اُٹھے دشت وجبل

پھر جنوں خیز بہاروں کی ہوا ہے سیفیؔ
پھر مچادی ہے کسی یاد نے دل میں ہلچل



آندھی وہ چلی آج کہ بدلی ہے فضا بھی
ہاتھوں سے حسینوں کے اُڑا رنگ حنا بھی

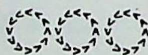
دشمن ہیں جہاں پر در و دیوار بھی اپنے
رہتا ہے اسی شہر میں وہ شوخ ادا بھی

کس راہ سے گزرے ہیں وہ یارانِ سبک رو
ملتا نہیں اس دشت میں نقش کف پا بھی

کیا فرق نظر آئے جو بینا نہ ہوں آنکھیں
چل جاتا ہے بازار میں کھوٹا بھی کھرا بھی

اُبھرا ہے یہ دریا تو بدلتا رہا سو رنگ
دل اشک فشانی میں رہا نغمہ سرا بھی

مرتے ہیں کبھی مرنے سے فنکار بھی سیفیؔ
ٹل جاتی ہے بالیں سے ہمارے تو قضا بھی





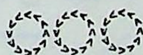
وہ بہاروں کا اک نگر ہے میاں
بادہ خواروں کا جس میں گھر ہے میاں

دل سے گزری ہے کہکشاں صورت
دیکھنا، کس کی رہگزر ہے میاں

وہ سراپا، وہ حسن ، وہ تمکین
وہ تو اک آفتِ نظر ہے میاں

ہاں وہی شوخ مسکراتی نگاہ
آرزو کتنی مختصر ہے میاں

بلیماراں میں جا رہا سیفیؔ
دیکھ لینا تو کس کے گھر ہے میاں





سقراط عدالت کے کٹہرے میں

اور سقراط نے یہ کہا تھا
مرے قتل کرنے کا فتوی دیا تم نے لوگو ؟
مرا وقت اب آگیا ہے، میں جانے کو ہوں ،
اور جاتے ہوئے پیش گوئی کرونگا
کہ مرنے سے کچھ پیشتر آدمی کی نظر کھلتی ہے
اور وہ آنے والے زمانے کو۔۔۔شفاف سی جھیل کی تہ میں بکھرے ہوئے
موتیوں کی طرح۔۔۔ دیکھ سکتا ہے

سنو۔۔۔
میں یہ کہتا ہوں تم سے مرے قاتلو:

جو سزا تم نے دی ہے مجھے
میرے جاتے ہی، اس سے ہزاروں گنا سخت آفت جھکڑ لے گی تمکو

مرے قتل کرنے سے تم یہ سمجھتے ہو
منہ بند ہونگے زبانوں پہ تالے پڑینگے؟ نہیں یہ غلط ہے
میں کہتا ہوں یہ بھاگ جانے کا کوئی بھی ممکن طریقہ نہیں ہے بھلے مانسوں کا
شرافت کا کہنا ہے اوروں کے تم ہاتھ پاؤں نہ کاٹو
سدھار اپنا اچھی طرح سے سمجھ لو
آسان تر ہے





ہر شام کی آغوش میں کھلتے نہیں شبو
تنہائی کے صحرا سے لپک جاتے ہیں آہو

دلی کے گلی کوچوں میں جب لوگگی اسکو
کشمیر کی جنت میں چلی آئی ہے اردو

دیوانہ ہے۔ دیوانے کی باتوں کا گلہ کیا
پھر جس پہ چلا ہو نہ کسی اور کا جادو

وہ دُھند برستی ہے نظر کچھ نہیں آتا
پھر شور کہ تاریک ہیں آئینۂ پہلو

خطرہ ہے کہ آئینۂ دل ٹوٹ نہ جائے
پتھر بھی اُڑا کرتے ہیں اس راہ میں ہر سو

سائے میں صنوبر کے بھی اُگ سکتے ہیں کانٹے
ہر درد کا درماں تو نہیں ہے قدو گیسو

سیفیؔ کا پتہ پوچھ رہے ہو نہیں معلوم
کس راہ سے لائی ہے صبا پار کی خوشبو



بے خیالی میں سہی سخت چلا ہے پتھر
اور پھر ٹھیک نشانے پہ لگا ہے پتھر
بے خبر کوئی چلا آئے تو مشکل ہوگی
گرتی دیوار سے بے طرح جھکا ہے پتھر
آپ کے ہاتھ میں آجائے تو پتھر سونا
ورنہ سونے کو بھی لوگوں نے کہا ہے پتھر
ہو تو سکتا ہے کسی جال میں پھنس کر نکلے
گہرے دریا میں ابھی ڈوب رہا ہے پتھر
آپ ٹوٹے ہوئے آئینوں کو گنتے چلئے
شہر کے شہر میں کیا گھوم چکا ہے پتھر

کس کو معلوم ہے کیوں اشک فشاں ہے سیفؔی
پھول کاندھوں پہ لئے ٹوٹ رہا ہے پتھر





پہلو میں تمنا کے بہاروں کا خدا تھا
دل صورت آئینہ اُسے دیکھ رہا تھا

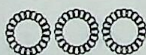
اس شہر میں ہر سمت جسے ڈھونڈ چکا ہوں
کہتے ہیں اسی موڑ پہ سو بار کھڑا تھا

کچھ سوچ کے پہلے تو چلا تھا مری جانب
نزدیک سے گزرا تو مجھے بھول چکا تھا

دل میں کسی بے نام سی منزل کی لگن تھی
ہاتھوں میں یہ ٹوٹا ہوا بجھتا سا دیا تھا

کیا جانئے کیا چیز کھٹکتی تھی نظر میں
وہ راہ میں پھر پھر کے مجھے دیکھ رہا تھا

اب آگ کے دریا سے گزرتے ہوئے سیفیؔ
کھلتا ہے صبا کو میں کہاں بھول گیا تھا





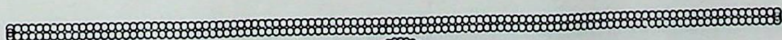
پھیلتا صحرا ہے آخر تو کہاں تک جائے گا
کوئی ہوگا تو صدا سن کر چلا ہی آئے گا

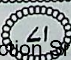
کون جانے پوچھتا رہتا ہے ہم سے کیا سوال
ہم نہیں ہونگے تو یہ گتھی کوئی سلجھائے گا

چار سو کھلتی ، سمٹتی ساعتوں کا اضطراب
یعنی حرف و صوت کا پرچم کہاں لہرائے گا

اس دوراہے پر کوئی نقش کف پا ہی نہیں
ہم وہاں پر ہیں جہاں کوئی بھی دھوکا کھائے گا

ان پہاڑوں میں کوئی گھاٹی ابھی سے ڈھونڈلو
دوپہر ہونے کو ہے سایہ ابھی جل جائے گا





پتھروں سے کیا نمی پھوٹے گی پھولوں کے لئے
باغباں کٹتی ہوئی شاخوں سے کیا پھل پائے گا

کس فضا کو گھورتے رہتے ہیں سوکھے پھول پات
آسمان برسے ہوئے بادل سے کیا برسائے گا

رات کی دہلیز پر چھایا ہے بے پایاں سکوت
لوگ ڈر جائیں گے پتا بھی اگر ہل جائے گا

ہاں اسے بھی ریت میں رہتی ہے سونے کی تلاش
بس یہی نکتہ تو ہے سیفی یہیں سے آئے گا





اب اس طرح نہ دیکھ زمیں سے اُٹھا مجھے
میں شمعِ رہگزار ہوں پھر سے جلا مجھے

شاید کسی بہار نے دیکھا نہ ہو کبھی
وہ پھول جو گلاب سے اچھا لگا مجھے

جلتے ہوئے چنار سے سائے کی آرزو
پتھر سے پھوٹتا ہوا چشمہ دکھا مجھے

میں کیا سنبھل گیا کہ ہوائیں پلٹ گئیں
طوفاں پہ اختیار کا دعویٰ نہ تھا مجھے

اپنی نگہ سے پھوٹتی شادابیاں نہ روک
صحرا کو سینچتا ہوا دریا بنا مجھے

آئینہ دے گیا انہیں سیفیؔ متاعِ حسن
دیتے رہیں گے پھول چمن کے دعا مجھے





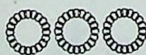
اس گلبدن کی کھوج میں جو خار و خس گیا
خوشبو کی طرح مست بہاروں میں بس گیا

یہ اور بات کانٹے کی قسمت نہ کھل سکی
ابرِ بہار کھل کے چمن پر برس گیا

پنچھی فرازِ دار سے آساں گزر گیا
ہاتھی ذرا سی دیر میں دلدل میں پھنس گیا

خوشبو خیالِ خام کی تفسیر ہوگئی
شعلہ اٹھا تو رنگ کا چہرہ جھلس گیا

کس نافۂ تتار کے پیچھے گئی صبا
آئینہ کس گلاب کو سیفیؔ ترس گیا





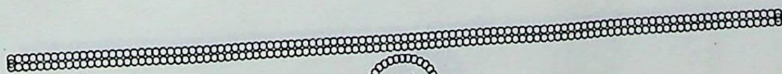
اس سلگتے ہوئے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے
وہ لڑھکتا ہوا پتھر بھی نہ دیکھا جائے

رنگ تو شیشے کی دیوار بھی ہو سکتا ہے
آنکھ کو راہ کا پتھر بھی نہ دیکھا جائے

برق سوئے نہ کہیں میری رگوں میں آکر
بحر سے مجھکو شناور بھی نہ دیکھا جائے

دیکھنے کے لئے ملتی ہیں نگاہیں سیفؔی
چار سو سدِ سکندر بھی نہ دیکھا جائے







خواب میں ٹوٹے ہوئے پُل سے گزرتا دریا
ذکر طوفاں کا کسی طرح نہ کرتا دریا

دیکھ تا حدِ نظر دھوپ میں جھلسے ہوئے پھول
دور آئینے میں دریا سے گزرتا دریا

دیکھتا رہتا ہے آئینے کی صورت تجھکو
بید زاروں سے یہ آہستہ گزرتا دریا

میں نے صحرا سے گزرتی ہوئی دیکھی ہے بہار
مجھکو لے ڈوبا ہے خوشبو کا بکھرتا دریا

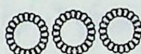
طنز کرتا ہوا سورج کی زباں بندی پر
یخ کی آغوش میں سمٹے گا ٹھٹھرتا دریا

بہہ گئیں تنکوں کی مانند کھڑی دیواریں
کیسے رُک سکتا پہاڑوں سے اُترتا دریا

دل سے ایسے مٹے صحرا میں سنورتا ہوا پھول
کیسے بھولے کوئی سائے میں سنورتا دریا

کان دھر کر کبھی روداد سفر سن لیتے
بات کرنے کے لئے کاش ٹھہرتا دریا

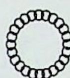
راہ جھلسے ہوئے گُل دیکھ رہے ہیں سیفیؔ
ڈوب ہی جائے نہ صحرا میں ابھرتا دریا



...... مسافر ......

شام ہو چکی ہے
سحر کی وادی میں چپکے چپکے سیاہیٔ شب اُتر رہی ہے
پرندے خاموش ہو گئے ہیں
میں اک مسافر،
ابھی جو منزل سے دور ہے اور جسکے بقچے میں کوئی زاد سفر نہیں ہے
گھنے اندھیرے کی ایک چادر سے مجھکو بھی ڈھانپ لے کہ جس طرح تو نے
شب کو سکون کی نیند کے لبادے سے ڈھک لیا ہے
کھلے ہوئے پھول کی تر و تازہ پتیوں کو
شفق کی خاموش تھپکیوں میں ، ملائمت سے لٹا دیا ہے
میں اک مسافر
ابھی جو منزل سے دور ہے اور جسکے بقچے میں کوئی زاد سفر نہیں ہے
لباس تن کا پھٹا پرانا
غبار سے اٹ گیا ہوں، دیکھو، میں تھک گیا ہوں
پکڑ لے اب میرا ہاتھ، دشوار ہے یہ منزل
جو سامنے ہے

ٹیگور (گیتانجلی سے ترجمہ)



یہ تو معلوم ہے ، پتھر کے نہیں ہوتے گُلو
ہم کو خنجر سے گِلا کیا ہے، خود اپنے ہیں عدو

گل تر سے ہے ، نہ آہوئے ختن سے پیدا
تیرے گیسو کی مہک، تیرے بدن کی خوشبو

کر گیا کس کے مقدر کا ستارہ روشن
چپکے چپکے تری پلکوں پہ ڈھلکتا آنسوں

بول آہستہ کہ سن لیتے ہیں دل کی دھڑکن
جاگ اُٹھے مری یادوں کے چمن میں آہو

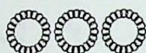
حسن کہتا ہے کہ تا عرش گئی میری کمند
کبھی انگڑائی کو اُٹھتے ہیں جو تیرے بازو

آپ سے ملتے ہیں غیروں کی طرح کیا کیجئے
ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ادب کا پہلو

میری ہر بات میں پوشیدہ جہانِ معنی
میری ہر بات سے ٹپکے ہے مرے دل کا لہو

اس سے بڑھکر بھی کوئی اور قیامت ہوگی
کہ شبِ ماہ گزرنے کو ہے بے جام و سبو

چاہے کتنا ہی مخالف ہو زمانہ سیفیؔ
مٹ نہیں سکتی مرے دیس سے ہرگز اردو





باد صبا میں کس گلِ تر کا اثر لگے
آئینۂ بہار سا دشت ہنر لگے

سر رکھدیا تو ریت بچھاتی ہے پَرنیاں
صحرا بھی راہ شوق میں اپنا ہی گھر لگے

آئینہ اعتبار میں خنجر اتار دے
مُشکِ ختن کی کھوج میں انسان کا سر لگے

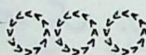
ساحل کے پیچ و تاب سے شہ مات ہوگئی
طوفاں کی آنکھ بھی نہیں لگتی سحر لگے

دیکھا نہیں کہ رونق محفل اسی سے ہے
پودا گلاب کا جو تجھے بے ثمر لگے

کس کس کی ناو دیکھئے اس پار جائے گی
ہر قطرے میں سکوں کے تڑپتا بھنور لگے

کھٹکا لگا ہوا ہے کوئی دیکھتا نہ ہو
ہر آئینے میں دل کی خطا مشتہر لگے

سیفیؔ ترے فراغ کی منزل ابھی کہاں
لمحے کا عمر بھر کے لئے ہی سفر لگے





گلوں کا بانکپن دیکھیں گریبانِ سمن دیکھیں
یہ کیونکر روز ہی لگتے ہیں چاکِ پیرہن دیکھیں

ہما کی کھوج میں ہم ساتواں در کھولنے جائیں
کہاں تک روکتے ہیں راستہ زاغ وزغن دیکھیں

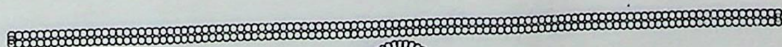
مقید ہی نہ تھا آئینے میں عکسِ گل افشانی
چھپی ہے سنگ میں کس طرح آہِ کوہکن دیکھیں

کہاں سے آئی ہے موج گہر میں سنگ سامانی
کسی گزرے ہوئے طوفان کی ٹھہری شکن دیکھیں

برستی آگ میں جھلسے ہوئے پھولوں کا منہ چومیں
گلے میں سادگی کے جھومتی ناگن کا پھن دیکھیں

اُبھرتے شور میں ہر ایک نغمہ ڈوب جاتا ہے
مری آواز کو پہچان لے گا کب چمن دیکھیں

صحیفہ تونے دل کا آجتک کھولا نہیں سیفیؔ
ذرا اس کی زبان سمجھیں ذرا اسکا متن دیکھیں





گل مہکتے ہیں، فضا راگ سنانے آئے
کیا دل و جاں سے گزرنے کے زمانے آئے

مڑ کے پیچھے کی طرف دیکھ لے دریا کا بہاو
گزرا موسم جو کوئی قرض چکانے آئے

سر پٹختا ہوا صحرا کو نکل جائے گا
لاکھ طوفان پہاڑوں کو اٹھانے آئے

دل کے آئینے میں تصویر تری دیکھے گا
کوئی بھی پھول نگاہوں میں سمانے آئے

نگہت گل کو اڑا لے گئی سرشار ہوا
کئی جھونکے مرے صحرا کو منانے آئے

دل پہاڑوں سے لڑھکتا ہوا پتھر تو نہیں
جس کو تقدیر سرِ راہ بچھانے آئے

سیفیؔ آئینۂ حیراں کی طرح سے خاموش
اس کو سمجھانے فسانے پہ فسانے آئے



تاریخ وفات پدر بزرگوار قبلہ حضرت مولوی غلام رسول
غفراللہ لہ وغمدہ فی بجوار رحمت والغفران
یکم ربیع ثانی ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۶ جنوری ۱۹۸۳ء

عصرِ اِمروز، حسبِ حکمِ خدا
کرد رحلت بجنت ماویٰ

پدرم مولوی غلام رسول
صاحب علم، مخزنِ تقویٰ

بست رخت سفر بہ اولِ ماہ
زیں سپنجی سرائے سست بنا

شہر، شہر ربع ثانی بود
یوم، یوم الاحد بعین شتا

بر سہ افزودہ چاردہ سَد سال
گشتہ از ہجرت نبی ورا

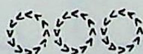
راسخ الاعتقادِ دینِ مبین
عاشقِ اتباعِ راہ ہدیٰ

داشت وِردِ زبان لبصبح ومسا
ذکرِ ربِ جلیل بی ہمتا

در تکلم چو رائحاتِ نسیم
در حدس فرد در ادب یکتا

بترحم کنند یاد او را
دارم از قارئین استدعا

نہ فراموش کنند سیفیؔ را
از دل خویشتن بوقت دعا



برق

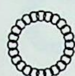
یہ شہر سو بار لٹ چکا ہے
اجڑ چکا ہے،
فقط سنہرے کلس کا مندر بچا ہے، وہ دیکھئے
جہاں شمع جل رہی ہے
اسی سنہرے کلس کے مندر کا دیوتا
چاندنی کی بارش میں
سر پہ سونے کا تاج ٹیڑھا کئے
بہاروں سے کھیلتا ہے

یہیں کہیں تیز تیز ندی کی شوخ لہروں سے کھیلتی ، اپسرائیں
اپنے لباسِ زر میں
حنائی ہاتھوں، دھنک سے خوشرنگ تار لے کر

چٹانوں کی اوٹ ،
مسکراتی ہوئی کوئی جال بُن رہی ہیں۔
کبھی کبھی تو یہ دیوتا

کھڑکیوں سے چوری چھپے نکلتا ہے اور
فضاؤں میں بانسری کی تانیں بکھرتی ہیں
ہر اپسرا جھوم جھوم جاتی ہے
ان کی لچکیلی باہوں سے
جال چھوٹتے ہیں ، وہ بھاگ جاتا ہے
برق صورت !





دل کا موتی بھی سنگریزہ صاف
توڑ دیجے یہ آبدار غلاف

خط کے تیور میں آرزو جُنبش
تیر، ماہی کی آنکھ تک ، اعراف

سرد ہاتھوں میں کانپ کانپ نہ جا
سبز ریشم کا گرم گرم لحاف

برق صورت ہزار آئینے
غرق عکسِ بہار کے الطاف

کون گزرا لہو لہاں سیفی
کس سے ہونے لگا یہاں انصاف





تو میری مان ، دل کو غلط آسرا نہ دے
پتھر سے پھول کھل نہیں سکتے صدا نہ دے

اندھا ہے موڑ ، راہ گذر بھی فرار کی
دیکھے بغیر کوہ سے پتھر گرا نہ دے

میں نے خود اس کے ہاتھ میں تلوار سونپ دی
اب کانپتا ہوں وہ مجھے اس کی سزا نہ دے

میرا چراغِ راہ بنے ، کربِ آگہی!
زخموں کا اندمال ہو ، ایسی دعا نہ دے

کھلتی نہیں ہے دھوپ اندھیرے ٹھٹھر گئے
آگ اعتبار کی مرا دامن جلا نہ دے

سیفیؔ وہ احتیاط کی دیوار گر گئی
آندھی چلی ہے ، راہ کی شمعیں بجھا نہ دے





ادا ادا سے دلوں پہ نازل ہوئے قرینے
صبا چلی تو گلوں کو آنے لگے قرینے

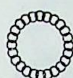
کسی نے آواز دی، تو سب ساز بج اٹھے ہیں
کسی نے پردے گرادئے، جل بجھے قرینے

حواس ہی کھودئے ہیں لگتا ہے گلستاں نے
نہیں تو سرو سمن کو بھی یاد تھے قرینے

یہ کس کی افشاں سے شب کو آنچل سرک گیا ہے
کہ کہکشاں کے ستارے لگتے ہیں بے قرینے

یہاں بھی سیفیؔ سکوت سانچوں میں ڈھل رہا ہے
نظر تو آتے نہیں تھے صحراؤں میں قرینے





شب کے پردے میں چھپا لوٹ لیا گھر میرا
کوئی چپکے سے اٹھا لے گیا گوہر میرا

کتنے باریک تھے پھندے کہ نظر آئے نہیں
سینکڑوں بار ہوا قید کبوتر میرا

ہاتھ روکا ہے کہ شیشے کا بنا ہوں میں بھی
لوٹ آئے نہ کہیں چھوٹتا پتھر میرا

اسی طوفاں میں کہیں سبز جزیرہ ہوگا
پھر گرجتا رہا کل رات سمندر میرا

تو جہاں چاہے، جس انداز سے چاہے چھپ جا
دیکھتا ہے تجھے سویا ہوا آذر میرا

آج سیفی مرا مہماں ہے شب بھر کے لئے
قاب زرتاب ، نہ لقمہ ہی مزعفر میرا





دیکھتا رہتا ہے کیا نقش کفِ پا کی طرف
راستہ یہ بھی چلا جاتا ہے صحرا کی طرف

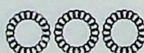
اپنی اپنی کشتیاں سر پر اُٹھائے بے خبر
جا رہے ہیں سب کے سب منہ زور دریا کی طرف

لغزشِ پا جس کے سر جائے وہ یخ بستہ پہاڑ
تنگ پگڈنڈی اترتی جائے دریا کی طرف

سنگ پر تحریر ہوتی جائے جُنبش کی ادا
اور ہر خط کھولتا ہے پر تمنا کی طرف

خود ہی اک سرسبز وادی کر گیا تھا میرے نام
دھیان ہی دیتا نہیں اب میرے دعویٰ کی طرف

ڈھونڈتا ہوں جسکو سیفیؔ وہ ہے پہلو کا چراغ
رات ہے اور جا رہا ہوں دل کے صحرا کی طرف





یہ سنگ آئینۂ اعتبار کی جانب
کھلی ہے آنکھ شکوہ بہار کی جانب

یقین جان کہ پتھر کا دل ہے پانی میں
رواں ہے ناؤ تری آبشار کی جانب

تمام عمر فقط انتظار میں گزری
گیا نہ کوئی بھی موسم بہار کی جانب

دیار فکر سے جب میں لہو لہاں گزرا
نگہ اُٹھی تو دلِ سنگ بار کی جانب

تمہاری جست فضائے بسیطِ امکاں میں
باعتماد نہیں، اختیار کی جانب

بہار چومتی آئی جبینِ گل سیفیؔ
خزاں کے ہاتھ اُٹھے برگ وبار کی جانب





دیکھنا ہے کہ یہ موسم ہیں سہانے کتنے
آئینے توڑ دیئے اندھی ہوانے کتنے

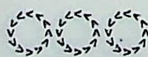
دُھوپ کھل جائے تو یہ برف کا پُل ٹوٹے گا
قافلے اور ہیں دریا کو بہانے کتنے

دل کی کھڑکی سے کبھی جھانک لیا تو ہوتا
اس بیاباں میں ہیں پوشیدہ خزانے کتنے

سوچ دریا کا ہر اک قطرہ بھنور ہوتا ہے
بادباں ہیں تری کشتی کے پرانے کتنے

بچ نکلنے کیلئے فکر کے صحراؤں سے
دل ، یہ چالاک، تراشے ہے بہانے کتنے

شمع جلتی رہے سیفی کہ ''سحر ہونے تک''
دل میں باقی ہیں ابھی داغ دکھانے کتنے





دیار فکر سے امکان کا گزر ہوگا
دلوں کا نور نگاہوں کا ہمسفر ہوگا

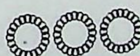
یہاں ہزار سفینے اسی تلاش میں ہیں
کسے خبر ہے کہ کس موج میں گھر ہوگا

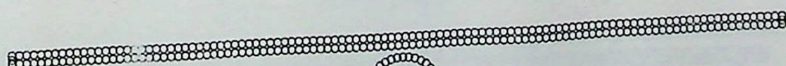
سرکتی صدیوں کے آئینے کیا کہا تو نے
مرے ہی کاندھوں پہ میرے عدو کا سر ہوگا

حیات ڈھونڈتی رہ جائے گی نشیمن کو
چہار سو فقط تاریکیوں کا گھر ہوگا؛

بلند ہوتی رہینگی سروں سے سب موجیں
ہزار ان کی زباں پر ابھر ابھر ہوگا۔

شب سیہ کی طوالت سے بہرہ ور سیفی
نگاہ برق میں آئینۂ سحر ہوگا







راستہ درد کے صحرا کا دکھادے مجھکو
چاند تاروں میں دھرا کیا ہے بتادے مجھکو

منتظر وسعت فردا ہے، کوئی جست بھرے
قید ہوں اپنی ہی باہوں میں چھڑادے مجھکو

سنگ رہ بن کے کھڑا ہوں، تو میں ہٹ سکتا ہوں
میں ہوں ماتھے پہ لکھا حرف مٹادے مجھکو

گہری کھائی ہے، اندھیرا ہے مرے دل کے چراغ
میں کہاں جاؤں کوئی راہ سجھادے مجھکو

گر پڑے ہیں جو انہیں پار اترنا ہے ابھی
پُل بپھرتے ہوئے دریا کا بنادے مجھکو

تنگ یخ بستہ چٹانوں سے اُترتی سیڑھی
تو مری مان لے، سیفیؔ، نہ بجھادے مجھکو



منقبت

بہ پیش گاہ حضرت شمس العارفین شیخ العالم شیخ نورالدین
نورانی نوراللہ مرقدہٗ

نندہ ریشی کا گلستاں میں چلا ذکرِ جمیل
ہے یہ کشمیر میں خوشبوئے سعادت کی دلیل
مل گیا وادیٔ کشمیر کو سینا کا فروغ
نور حق سے جو ہدایت کی ملی ہے قندیل
منبعِ نورِ ھدیٰ ' واقفِ اسرارِ ازل
شہسوارِ رہِ اعجاز ، ہمسر نہ عدیل
تیرا ہر لفط دل و جاں کے لئے آبِ حیات
تیرا ہر سانس فقط نغمۂ سازِ تہلیل
نقش پا سے تیرے ملتا ہے نشانِ منزل
تیرے انفاسِ مبارک سے مہکتی ہے سبیل

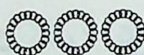
عاشقوں کو تیرا ارشاد بشارت کی سند
عارفوں کے لئے مشعل ترے افکارِ جلیل

ھادی راہِ صفا، صدر نشینِ تقویٰ
صلح کُل مشرب و طغرئ سعادت اکلیل

صاف آئینے کی مانند ہے باطن تیرا
جیسے گلزارِ اِرم کی کوئی شفاف سی جھیل

تو اگر چاہے تو صحرا کو بھی سیراب کرے
چشمۂ فیض رواں آج بھی ہے صورت نیل

آپ کا لطف و کرم ہو تو ملے غم سے نجات
آپ کی ایک نگہ سے ہو مقدر تبدیل؛





سائے کی طرح ساتھ لگے واقف ناں کی
دل ٹوہ میں رہتا ہے اسی دشمن جاں کی

پتھر کے بنے دل تھے حنا بستہ فضا تھی
بکتے تھے جہاں پھول سر راہ وہاں کی

آنکھوں میں لئے حیرت آئینہ کے انداز
تصویر اتر آئی مرے سرد گماں کی

پتھر سا لٹکتا پرِ پروازِ کے نیچے
اُبھری نہ صدا ہی مرے گم گشتہ جہاں کی

پوچھو تو گزرتے ہوئے سایوں کے اشارے
ہم بات سمجھتے نہیں غیر اہل زباں کی

ہاں اب مری آواز ہے شاید مری آواز
آنکھوں سے کوئی بات ہوئی دل کے جہاں کی

کچھ عکس تھے، ٹوٹی ہوئی۔ پتھر کی۔ ردا میں
اک اسم کی تاثیر میں تھی کاٹ سناں کی

یہ دیکھ مرے ہاتھ میں مہتاب کا آنچل
سچی نہ کوئی بات ہوئی سنگِ گراں کی

کہتے ہیں کہ گھر پر کبھی ہوتا نہیں سیفیؔ
سو بار تلاشی تو ہوئی اس کے مکاں کی





خاموش ہے، تاریک ہے، یہ راہ گزر جا
آئینہ اُٹھا کل کی نگاہوں میں سنور جا

دل کہتا ہے لا توڑ کے آکاش سے تارے
جب کہتا ہے ،ہاں گہرے سمندر میں اُتر جا

تو شام کی آغوش میں اک ٹوٹتا تارا
میں تیرا پتا پوچھ تو لوں تجھ سے ٹھہر جا

خود اپنی نگاہوں سے ابلتے ہیں اندھیرے
تو لاکھ یہ الزام کسی اور پہ دھر جا

وہ صبح کہ تاخیر اُجالے کی جبیں تھی
وہ شام کہ آغوش تڑپتی تھی اُتر جا

ہر درد پہ چھا جائے اسی گل کا تبسم ؛
سیفیؔ کبھی اشعار کی خوشبو میں اُتر جا





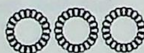
بادباں ٹوٹ گیا سبز جزیرہ مجرم
آنکھ برجستہ کہے، کیلے کا چھلکا مجرم

دھوپ سی جھیل میں شب جھومتے بیتاب کنول
قدحِ سنگ ، سراسیمہ ستارا مجرم

قلۂ کوہ سے بہتے ہوئے شعلے، سر سبز
یاس کے دشت میں دھنتا ہوا دھارا مجرم

گیت مہندی کو سناتا ہوا حرمل، دلشاد
سر پٹختا ہوا دہلیز پہ دریا مجرم

گھنے جنگل کا دھواں پھولوں کی خاطر اکسیر
چشم بیخواب میں ڈوبا ہوا صحرا مجرم





نکہت گل کی طرف تیرا سفر آئینہ ہے
تیرا ہر نقش قدم تیری نظر آئینہ ہے

کون جانے کس لئے پتھرا گئیں آنکھیں مری
رنگ کی دیوار ہے ، دیوار پر آئینہ ہے

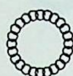
تیرے انداز نظر کے پشت و رو پر منکشف
یہ پر افشاں زندگی آئینہ در آئینہ ہے

مل نہیں سکتا تھا میری لغزش پا کا سراغ
نقش پا میرا بھی کتنا معتبر آئینہ ہے

تو گزر جاتا ہے تو بن جاتی ہے ہر دیوار آنکھ
دیکھ اب تیرے لئے ہر رہگزر آئینہ ہے

آنکھ کھلتے ہی وہاں یوسف کا سودا ہوگیا
حرف کی دیوار میں ،سیفی، نظر آئینہ ہے





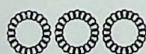
وہ صبح جب فصیل کوئی درمیاں نہ تھی؛
وہ شام، جب نگاہ پہ منزل عیاں نہ تھی

بس ایک در کھلا تھا میری دامگاہ کا
دیوار سامنے کی مقفل کہاں نہ تھی

دیکھا تو برف زار پر تھے خون کے نشان
سوچا تو آفتاب کے منہ میں زباں نہ تھی

خارا صفت فصیل کے در مسکرا اُٹھے
صحرا کے دل میں چیخ مری رائیگاں نہ تھی

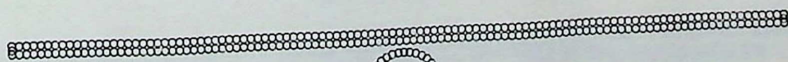
سیفؔی تری تلاش میں سائے ہی جل گئے
کس موڑ پر یہ راہ مرا امتحاں نہ تھی





پھول کی خوشبو میں ہوسکتا ہے گھر فولاد کا
موم کی ہر شاخ بھی مانگے ثمر فولاد کا







وہ عکس آئینے میں مکرر بھی آئے گا
اُس راستے میں میرا مقدر بھی آئے گا

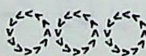
بادِ صبا کی نرم روی کیا سند ہوئی
شیشے کا ہو مکان تو پتھر بھی آئے گا

وہ خیر و شر کی کھوج میں ہر سنگ میل تک
ہاتھوں میں لے کے اپنا مقدر بھی آئے گا

آندھی میں وہ جلائے چراغ احتیاط کے
آنکھوں میں لے کے سات سمندر بھی آئے گا

جب آئینے میں عکس بکھر جائیں چارسو
قد میں کبھی وہ میرے برابر بھی آئے گا

سیفیؔ ابھی سے کھولئے یہ سبز بادباں
اس راستے میں گہرا سمندر بھی آئے گا





سمندر راہ میں پڑتا ہے سر پر آسماں ہے
تمہارا اس میں کیا جاتا ہے یہ میرا زیاں ہے

مجھے اس باب میں تم سے شکایت ہی نہیں ہے
اسے میں نے بنایا ہے یہ میرا ہی جہاں ہے

بتادوں کیسے لوحِ سنگ پر کیا لکھ گیا ہے
اندھیرا ہے کہ سورج سات پردوں میں نہاں ہے

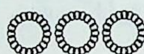
اسی پردے پہ میرا مو قلم آئینہ ساماں
گذرتی میرے ہی آنگن سے جوئے نغمہ خواں ہے

پکڑ کر لائے ہیں مجھکو دھکیلا جارہا ہے
وہ خود ہی لکھتے جاتے ہیں یہ کیسا امتحاں ہے

کڑکتی بجلیوں کی بات ہر بادل کے منہ میں
غضب یہ ہے کہ میرے سر پہ پھٹتا سائباں ہے

مرا دعویٰ کہ سب طائر اُفق کے پار ہونگے
مگر آندھی کہے ٹوٹا ہوا ہر بادباں ہے

کسی انجانے صحرا میں مجھے لائے ہیں سیفیؔ
جہاں کھلتا نہیں میں کون ہوں جانا کہاں ہے





نظر نہ سنگ میں آئے گلاب کون کہے گا
غلط ہے آئینۂ دل حساب کون کہے گا

اُٹھاکے لے گئیں سورج کو آسمان سے آنکھیں
کہاں کہاں نہ چھپے تھے سراب کون کہے گا

بس ایک جھیل میں مشکِ گلاب تیر رہا تھا
اب اس پہ کیسے رہے ، احتساب کون کہے گا

درشت ریت کے ٹیلوں کو پھاندتے ہوئے چشمے
جھلستی راہ کی باہوں کا خواب کون کہے گا

ہر ایک موڑ پر رستہ بدل رہی ہیں ہوائیں
کھلیں گے کیسے فصیلوں کے باب کون کہے گا

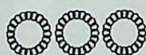
پلوں کو توڑ کر پانی سے جست کر گیا سیفؔی
جو بحر ہوگیا اس کو حباب کون کہے گا

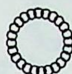




سنا رہا ہے گلِ زعفراں کو چاند پیام
ہزار شہر طلب ، ایک شعلگی کا خرام
گلاب کو بھی سمجھتا ہے سادگی کی شبیہ
تجھے خبر ہے مچا ہے کہاں کہاں کہرام
فریب دے گئی انگڑائی نقشِ پا کی اسے
سرک وسیع بیاباں کہ کھو گیا بہرام
بھنور محیط کی گہرائی ، موجِ برق طلب
وقیع تر ہے گہر سے نظر کا استحکام

برس گئی ہے گھٹا ، دشت کھل اُٹھا سیفیؔ
ملا ہے دل سے فقط ایک ثانیے کو دوام





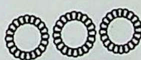
دشت میں ڈوب گیا گہرا سمندر نایاب
ایک تصویر کے پردے میں تھا گوہر نایاب

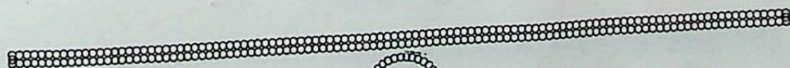
شام شعلوں میں تڑپتی رہی انگور کی بیل
پھر گرجتا ہوا دریا تھا سراسر نایاب

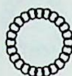
اب تو اس شہر میں اُگتی ہیں جھکی دیواریں
اب تو ناموس کے مندر کا ہوا در نایاب

ہاں جہاں آگ کے شعلوں سے جھلستے ہیں گلاب
ہے اُبھرتے ہوئے صحرا سے سمندر نایاب

رنگ اور سنگ سے چھپتے رہے سیفؔی وہ خطوط
دل کے مانی کی طرح، آنکھ کا آذر نایاب







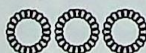
مری نگاہ کے آگے وہ بجلیوں کا جہاں تھا؛
خیال تاب و تواں تھا سراب حکم بیاں تھا

خود اپنے دل کے ارادوں سے لوگ کانپ رہے تھے
لباس حرف میں آتا تو راز کتنا گراں تھا

دلوں کی بات الگ ہے دلوں کا برق سے رشتہ
الٹ گئی جہاں کشتی وہ آبشار گماں تھا

ہر ایک برگ کے پردے میں رنگ بول رہا تھا
شعور آئینہ ساماں، سرور جلوہ گماں تھا

دکھا کے آئینہ سیفیؔ اُتر گیا ترے دل میں
ہمارے گاؤں کا دریا بہت آہستہ رواں تھا





رات کا تاریک سناٹا سفر کا آشنا
دل بھرے بازار کی باہوں میں صحرا آشنا

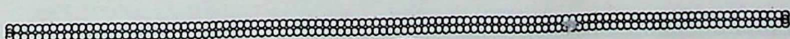
جیسے پھولوں کو نہیں پہچانتی بادِ صبا
جیسے گلشن میں نہیں کوئی کسی کا آشنا

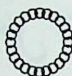
ڈولتی، موجوں سے ٹکراتی ہوئی، کشتی مری
جھانکتا ساحل، گرجتا تیز دریا آشنا

چارجانب سے نگاہوں کی کڑکتی بجلیاں
ایک پہلو میں دھڑکتا دل ہمارا آشنا

وقت پڑتا ہے تو بس پتھر تلے کا ہاتھ ہے
تیشہ بھی ہوتا تھا سیفیؔ، کوہکن کا آشنا







غاروں سے نکلتا ہوا صحرا نظر آیا
دیوار کا ہٹنا تھا کہ دریا نظر آیا





شب مہ نے کیسے نور کے دریا بہادئے
دیوار و در کو رات کے قصے سنا دئے

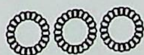
کھُل کھُل کے لوحِ سنگ پر اُبھرے وہی نقوش
تیری نظر بچا کے جو دل نے مٹا دئے

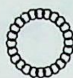
آندھی چلے پہ بھی مرے فانوس تھے درست
گھبرا کے میں نے سارے دئے خود بجھا دئے

تو آئے یا نہ آئے تجھے اختیار ہے
راہوں میں تیری پھول تو میں نے بچھا دئے

کنکر کسی نے پھینک دیا ہے، تو وہ نہیں
شاید کسی نے چھت سے کبوتر اڑا دئے

ڈھلنے لگی ہے رات ہوئے راستے خموش
سیفیؔ یہ انتظار کہاں تک بجھا دئے





بس ایک جست میں تہ کردیا بیاباں کو
کہیں سے راہ تو مل جائے گی گلستاں کو

مجھے تو ڈر ہے کسی بادباں کی خیر نہیں
بہت قریب سے دیکھا ہے میں نے طوفاں کو

برس برس گئیں شادابیاں چہار طرف
خبر ہوئی نہ مری آگہی کی نیساں کو

رہا ہوں دست وگریباں میں بے خطا دل سے
اگرچہ توڑنا آساں تھا سنگ داماں کو

خطاب یوسفِ کنعاں کا مل نہیں سکتا
تلاشِ حسن میں ہر ایک چاک داماں کو

سبا کی رانی سے پوچھیں نہ حالِ دل سیفی
بچا بچا کے تو لائے ہیں ہم سلیماں کو





نکھرے جو نقش دل کے اُفق پر تمام رات
اُبھرے سمندروں کو جگا کر تمام رات

تارے بھی چپ تھے چاند بھی کھویا ہوا سا تھا
گرجے زمیں پہ سات سمندر تمام رات

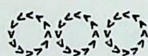
پھر دل کی خواب گاہ سے پردے اُڑا لئے
آندھی سے بچ سکا نہ کوئی گھر تمام رات

نیت کے چور تھے کہ ارادوں کے راہزن
کتے سے بھونکتے رہے باہر تمام رات

بار گراں تھا کاندھوں پہ یخ بست تھے پہاڑ
خیمے اُکھڑ رہے تھے برابر تمام رات

یاد آگئی وہ شام کی خوشبو کنار جو
گزریں قیامتیں مرے دل پر تمام رات

آنکھیں برس برس گئیں سیفی ترے لئے
دامن سمیٹتا رہا گوہر تمام رات





پھر صبحِ تبسّم میں بھی کیا مات نہیں تھی
لہرائی صبا جیسے کبھی رات نہیں تھی

آنکھوں کا تھا قصور کہ آگے نہیں بڑھے
جانبر تو مجھ سے سازشِ حالات نہیں تھی

یہ ٹھیک ہے کہ خوبیاں اس میں بھی تھیں ہزار
بڑھ جاتا تم سے آگے، وہ اوقات نہیں تھی





لوٹ کر بت سے جو اُچھلے سبھی کنکر آئے
جن سے توڑے تھے کبھی شیشے وہ پتھر آئے

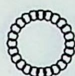
چشمہ ساروں کے کنارے جلی انگور کی بیل
سوکھ جانے کے لئے لاکھ سمندر آئے

شہر کا شہر تھا سویا ہوا صحرا کی طرح
کون کہہ سکتا ہے وہ دیر سے کیوں گھر آئے

جن سے پتھر کی طرح جا نہ سکی ہے آواز
راہ میں ایسے بہت گنبد بے در آئے

سونگھ لو سبزے کی خوشبو کو ذرا اب سیفیؔ
آسمانوں کی بہت سیر تو تم کر آئے





تری نگاہ کا روکے رہا حصار تُجھے
پکارتا رہا صحرا ہزار بار تُجھے

زمانہ تجھ سے لکھانے لگا تھا لوحِ جبین
صبا نے سونپا تھا خوشبو کا کاروبار تُجھے

وہ شہسوار گزر بھی چکا ہے صحرا سے
نگل گیا ہے مگر راہ کا غبار تُجھے

پلٹ پلٹ کے بہاروں میں گنگناتا ہے
وہ ایک لمحہ کہ رکھتا ہے بیقرار تجھے

میں جانتا ہوں کہ نازک ہے آبگینہ ترا
قدم قدم پہ تو ہونا ہے سنگسار تُجھے

چمن کا رنگ تو سیفیؔ پلٹ دیا ہوتا
ہوا کے جھونکوں پہ حاصل تھا اختیار تُجھے





دیارِ سنگ میں گونجا ہوا ترانہ تھا
وہ میرا بھولا ہوا خواب تھا، فسانہ تھا

سنبھالتے رہے شیشوں کو سنگباری سے
کہ عکس عکس کا انداز جارحانہ تھا

رواں تھا کھوجتی آنکھوں سے خون کا دریا
وہ کس کماں سے چھٹے تیر کا نشانہ تھا

جلا کے رکھدئے دل کے تمام نقشِ قدم
کس آفتاب کی آغوش آشیانہ تھا

دلوں میں جھانکنا آسان نہیں مگر سیفیؔ
تری نگاہ کا انداز والہانہ تھا

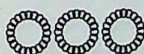






ناسور ہے کتے نے جہاں کاٹ لیا ہے
یہ ڈنک جو مکھی نے دیا، زہر بجھا ہے
ہر سانس کے پردے میں چھپا کھولتا چشمہ
ہر چہرے پہ احساس کا آئینہ لگا ہے
کانٹے کو خبر ہی نہیں کیا چیز ہے خوشبو
اور پھول سمجھتا ہی نہیں آئینے میں کیا ہے
شاید کہ گزر جائے صبا آبِ بقا سے
پھولوں نے گلستاں میں کوئی زہر پیا ہے
پہلو میں دھڑکتا ہوا دل ہے تو سمجھ لے
ہر پھول یہ کہتا ہوا گزرا کہ خدا ہے

کنکر سے کوئی رنگ جھلک ہی نہیں سکتا
کس بات پہ سیفیؔ تراخوں کھول رہا ہے





آہو

سبزے تو نے نہ قسم کھائی تھی چپ رہنے کی،
کون یہاں سے گزرا
لے گیا کون ستاروں کی چمک
اور گلابوں کی مہک !
کہکشاؤں میں ہے اب شورِ قیامت برپا
ہر سمت بہاریں بھی گئیں
ایک ایک پھول کے سائے میں اُتر کر دیکھا
پیرہن چاک ہوئے
اب تو ہر سینہ بھی تیروں سے ہوا ہے چھلنی
آنکھ نمناک تو تھی !
سر پٹختا ہوا دیوانے کی مانند
صبا کا جھونکا ۔ اوٹ میں پھولوں کی ۔
چشمے کے کنارے پہنچا
چاند پانی سے جو اُبھرا تو ۔ ہر اک قطرے میں
دوڑ رہے تھے آہو ،
اُن کے پیچھے تھے شکاری کتے !!!

...... نذرِ غالب ......

دیکھ ، سفر آئینہ ، غبار نہیں ہے
شاخِ طرب مایۂ قرار نہیں ہے

کہہ تو دیا صاف صاف عکس نہ آیا
پھول کو آئینہ سازگار نہیں ہے

غنچہ مرے دل کی بات کیسے کہے گا
بادِ صبا پر تو اعتبار نہیں ہے

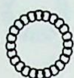
چھوٹ گئے موج موج دست شناسے
زورقِ برق احتساب پار نہیں ہے

دل میں ترے لاکھ آفتاب اُگائے
چشمِ سحر کار سنگ بار نہیں ہے

اپنی نظر برگ برگ خار تماشہ
آئینے میں کون سنگسار نہیں ہے

دشتِ سفر گرد باد حکم ہے سیفیؔ
آنکھ کسی طرح اشکبار نہیں ہے





کوئی گہری کوئی گمبھیر گمک پہنچے تو
میری آواز کبھی آپ تلک پہنچے تو

شور کرتا ہوا گزرے گا یہیں سے دریا
میکدے سے کبھی ساغر کی کھنک پہنچے تو

کہکشاؤں سے پرے سبز ستارے کی چمک
میری آواز کبھی تا بفلک پہنچے تو

کیسے تسلیم کریں باد صبا کا دعویٰ
تیرے آنگن سے گلابوں کی مہک پہنچے تو

تو بھی میری ہی طرح چیخ پڑے گا سیفیؔ
دل میں تیرے کبھی کانٹوں کی کسک پہنچے تو





ہر گل کو بے نیازئ صحرا کا احترام
دریوزہ گر نگاہ کا ہے کاسۂ کرام

بادِ صبا کی آنکھ بھی اُٹھتی تو جانتے
گل نے لیا نہ تھا کبھی گوہر سے انتقام

آئینے کو ملی ہیں نئی مسکراہٹیں
کُحلِ بصر کے سنگ تُلا ہے مرا کلام

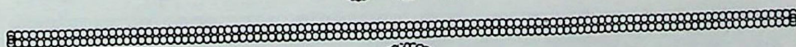
آنکھوں کی راہ سے اگر دل میں اُتر سکے
آئینے کی نگاہ ہے شمشیرِ بے نیام

رحمت کا ابر سایہ فگن عالمین پر
بارش برس رہی ہے برستی رہے' مدام

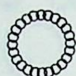
یوں شوکتِ چنار سے شاخوں کو نوچنا
فصلِ خزاں کی آندھیو تمکو مرا سلام

سیفیؔ مہک رہا ہے تمنا کا انگ انگ
صحرائے دل میں کونسی خوشبو لئے ہے شام









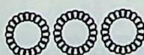
صبا آئینے سحرِ سامری سے کم نہیں ہیں
عبا پیرا فرشتے ہیں، بنی آدم نہیں ہیں

یہ جلتی دوپہر، یہ ریگزار، آتش بداماں
چناروں کے خنک سائے یہاں مرہم نہیں ہیں

میں اس جنگل سے نکلا ہوں تو صحرا جھوم جائے
وہ کیسا شہر ہے گلیوں میں جس کی خم نہیں ہیں

ہوس کے سنگ اُن کو ناچتے دیکھا ہے میں نے
زباں سے جو کسی کے سامنے سر خم نہیں ہیں

سمندر کی تہوں میں سبز ہیرے چھپ چکے ہیں
پکارے ہے مرا آئینہ سیفیؔ ہم نہیں ہیں





اُفق اُفق سے پتا آندھیاں اُبھرنے کا
کہ ذرہ ذرہ ہے صحرا میں گھر بکھرنے کا

اتھاہ بحر میں میری گرفت سے باہر
یہ ڈوبتا ہوا پتھر نہیں اُبھرنے کا

گرفتِ سنگ میں کیسے اُڑاں آئی ہے
یہی تو لمحہ تھا امکاں میں جست بھرنے کا

اب آؤ آئینہ لے کر کھڑا ہوں میں کب سے
یہی تو وقت ہے تیرے لئے سنورنے کا

تمام شہر ہوا ہے لہولہاں سیفیؔ
دلوں کو چیرتا کانٹا نہیں سدھرنے کا



خدا حافظ

بچھڑنے والے رفیقو سنو خدا حافظ
بہت شدید ہے دکھ، آپ سے جدائی کا
یہ غم کے بول جو میری زبان پر آئے
رفاقتوں کی، محبت کی، ہم نشینی کی۔
حسین یادوں نے دل میں یہ گل کھلائے ہیں
کٹے ہیں شام و سحر مسکراہٹوں کے طفیل
مگر حیات فقط دل لگی کا نام نہیں
یہ راہ دشت کے کانٹوں سے ہو گزرتی ہے
دلوں سے خون تو آنکھوں سے اشک بہتے ہیں۔
قدم قدم فقط احساسِ خستہ پائی ہے
مگر سنو، وہ سبق بھولنا نہیں ہر گز
ہزار ٹھوکریں کھا کر جو ہم نے سیکھا ہے
ہماری راہ میں آندھی ہو یا کہ طوفان ہو
گرے ہوؤں کو بھی دریا سے پار کرنا ہے
وطن یہ وعدہ ہے ہمت کبھی نہ ہاریں گے



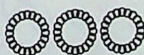
گزرتے لمحوں کے منہ سے نکلا سحر مثالی
ورق ورق پہ لکھا ہے فردِ بشر مثالی

یہی جو طوفاں کا شور کانوں مین آرہا ہے
اسی کی ہر موج میں ملے ہیں گہر مثالی

خیال کے آئینوں سے گرد و غبار پونچھیں
کرن کرن کے لئے بنانا ہے گھر مثالی

اُڑے مری جھیل سے تو اک دائرہ حسیں تھا
فضا میں پھیلے تھے راج ہنسوں کے پر مثالی

دلوں کے مابین سرد صدیوں کے فاصلے تھے
نگاہ میں طے ہوئے ہیں سیفیؔ سفر مثالی





وہ سبز ہیرا جو میں نے وقتِ سحر نہ پایا
میں رات بھر ڈھونڈتا رہا ہوں مگر نہ پایا

پلوں کے نیچے سے سو سمندر گزر چکے ہیں
سیاہ خارا کو موج سے بہرہ ور نہ پایا

ہر ایک لمحے کی زیرپا آتش استقامت
کسی روایت کو اسقدر معتبر نہ پایا

یہیں تڑپتے ہوئے تو جیون مرا کٹا ہے
کہ میں نے صحرا کے ماسوا کوئی گھر نہ پایا

انا کے جس بیستوں کو دل جانچتا ہے سیفیؔ
کٹھن تو اس درجہ اور کوئی سفر نہ پایا





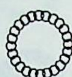
وہ لمحہ کہ آئینے کو آتا ہے خدا یاد
کس گل کے سنورتے ہوئے دل کو نہ رہا یاد

کس دشت کی پہنائی میں گم ہوگئی خوشبو
آتی رہی آنگن کو مرے بادِ صبا یاد

کیا کیجئے اس لوح سے مٹ جاتی ہیں یادیں
اس دشت میں آتے ہوئے اک نام تو تھا یاد

جس کشتی میں آئی ہو جہاں ڈوب چکی ہے
کھوئی ہے کہاں تونے انگوٹھی مجھے کیا یاد

ہر نقش فقط عجز کی تصویر ہے سیفیؔ
آئینے کو وہ لطفِ تبسم ہی نہ تھا یاد



دل اس نگری میں جلتے رہنے کا ساماں تو ہوگا
یہاں آئینے کی مانند تو حیراں تو ہوگا

کہاں ڈوبا تھا صحرا میں گرجتا تیز دریا
وہاں سے پاسبانوں تک سفر آساں تو ہوگا

تجھے باور نہیں کٹتی ہیں آنکھوں میں بھی راتیں
خود اپنے دل کے ہاتھوں سے کوئی نالاں تو ہوگا

نہ مجھ میں رنگ ایسا ہے نہ خوشبو اس طرح کی
وہ کانٹوں سے الجھتے رہنے میں یکساں تو ہوگا

اکیلا آندھیوں میں برف و باراں سے نپٹتا
کوئی طوفاں سے ٹکراتا ہوا انساں تو ہوگا

سخن مضراب ہے بجتے ہیں چھپ کر ساز سیفیؔ
وہ دل ہی دل میں میرے نام سے شاداں تو ہوگا





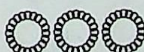
ترا خیال زمانہ پڑھے بغیر رہے گا
کھلی پڑی ہوئی دل کی کوئی کتاب سنا ہے

خود اپنے آپ کو کھو آئیں گے گہر کی طلب میں
سمندروں میں اُترنے کو ہیں حباب سنا ہے

مرا تو آگ کے شعلوں سے پور پور جلا ہے
تمہارے سر سے بھی گزری ہے موج آب سنا ہے

نئی فضاؤں کی جانب سرک رہے ہیں بیاباں
سمندروں پہ برستے ہوئے سحاب سنا ہے

ٹھٹھرتی رات میں کون آگ پھونکنے لگا سیفیؔ
ستاروں نے مرے دل کا فقط رباب سنا ہے





تھرکتی لاشوں پہ اُڑتے رہے غُراب یہاں
عجیب طرح کے دیکھے ہیں میں نے خواب یہاں

ستاروں کو ہی خبر تھی نہ چاند نے دیکھا
کہ جلتے شہر پہ برستے رہے سحاب یہاں

ابھی ہیں راہ میں سیسہ پلائی دیواریں
ابھی تو خواب کی بستی ہے زیر آب یہاں

جہاں برستے ہیں تری نگاہ کے سائے
وہ سرزمیں کہ ہوا جس کا انتخاب یہاں

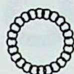
نظر اٹھا کے چٹانوں کو چیر جاتے ہیں
ہلا کے ہونٹ کھلا دیتے ہیں گلاب یہاں

صبا چلے پہ تو آتی ہے باس پھولوں کی
مگر خیال کی خوشبو ہے دریاب یہاں

زباں ہلانے سے ہٹتی نہیں ہیں دیواریں
تو چاہنے سے برستے نہیں سحاب یہاں

کن آئینوں سے گزرتا ہے عکس گل سیفیؔ
پہاڑ بن گئی آنگن کی جوئے آب یہاں





سیاہ رات تھی روشن کوئی دیا بھی نہ تھا
زبانِ حرف پہ امکانِ مدعا بھی نہ تھا

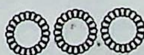
فراز کوہ سے جنگل لڑھکتے جاتے تھے
کہیں سے بھاگ نکلنے کا راستہ بھی نہ تھا

خبر نہ تھی کہ چٹانوں میں بھی دریچے ہیں
میں اس گلی میں کبھی آج تک گیا بھی نہ تھا

مجھے قریب سے چھو جاتی تھی نظر اس کی
وہ دیکھتا تھا مجھے اور دیکھتا بھی نہ تھا

بتوں سے پاک نہ کوئی بھی آستیں تھی وہاں
جو مجھ کو مجھ سے ملاتا وہ آئینہ بھی نہ تھا

برستی آگ کے صحرا میں سو گیا سیفیؔ
جہاں چنار کے سائے کا آسرا بھی نہ تھا



...... آ خوشبو ......

جب رات سبھا میں تاروں کی
خاموشی کی چادر اوڑھے
سوجاتی ہے

مہکار چنبیلی کی ہرسو
سرمستی سے انگڑائی میں
لہراتی ہے

ہلکی سی پون، پھولوں کی خوشبو
آنچل میں لیکر آنگن کو
مہکاتی ہے

مجھے کوئی یاد ستاتی ہے





مسافتیں ہوئی جاتی ہیں انتہا کے قریب
میں اک وجب سے بھی ہوتا اُس آشنا کے قریب

وہ شاخِ تاک تھی اڑا لے گئی ہوا اسکو
جو چشمہ تھا سو چھپا دست نارسا کے قریب

گلے میں کانٹے پڑے تھے مگر زباں نہ کھلی
فرات بہتا رہا دشت کربلا کے قریب

وہ قافلہ جسے بس ایک شب کی مہلت ہے
خدا وہ قافلہ پہنچا ہے، کربلا کے قریب

دلوں میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے سیفیؔ
جلا ہے خیمہ یہاں ایک باحیا کے قریب





چھپ چھپ گئی ہے کیسی بہاروں میں چاند رات
تاریکیوں میں ڈوب گئی ساری کائنات

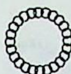
کھڑکی کھلے تو سدِ سکندر سے جھانک لیں
پہلو میں لے کے سوگئی بے خوابیوں کے رات

دل کا چراغ آندھی کی آغوش میں پلا
صحرا کے سنگ سنگ تڑپتے رہے فرات

کس بحرِ بے کنار میں ڈوبی ہیں کشتیاں
ساحل پہ اشکبار ہے کیسی حسین رات

نیلے سمندروں میں ستارے اتر گئے
راہوں کا نام ہو گیا سیفی پل صراط





کیسے طوفانوں کا ہے گھر سینے میں
ٹوٹ رہا ہے دل سا گوہر سینے میں

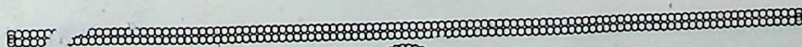
ہاں گل کو میرے دل کا اندازہ ہے
بات کرے تو تڑپے خنجر سینے میں

دن کو دو دو خوں کے دریا جاری تھے
شب جاگے تھے سات سمندر سینے میں

تم نیلے آکاش کو آئینہ کہدو
خواہش نے کھولے ہیں شہپر سینے میں

خود اپنی آنکھوں سے چھپتا پھرتا ہے
دل سیفیؔ ، یا نیلا پتھر سینے میں







یہ دیوار سے کس کے شانے لگے ہیں
کہ سب لوگ پتھر اٹھانے لگے ہیں

ترے قرب ۔ آواز کی نغمگی ۔میں
یہ سناٹے پھر ڈوب جانے لگے ہیں

کنول چار سو جھیل کی آبرو ہیں
یہاں تک سفر کو زمانے لگے ہیں

نظر آئینہ ہو تو صحرا سُجھا دے
کڑی دھوپ میں شامیانے لگے ہیں

پکارا کئے جو اُجالا اُجالا
وہی لوگ شمعیں بجھانے لگے ہیں

ہر ایک سنگ سے خشت سازی ہوئی ہے
جو سب سانحے ریوں ٹھکانے لگے ہیں

ملی ڈھیل اس آستاں سے تو سیفیؔ
مہ و مہر پھر بار پانے لگے ہیں





تنہائیوں کو وسعت صحرا کا پیار دے
دل کو کچھ انبساط کے لمحے ادھار دے

دل آئینوں کو پھیر دے دھندلاہٹوں کی سمت
یعنی مرے خیال کی دنیا نکھار دے

انسانیت کی شمع ہواؤں کی زد پہ ہے
اس کو نگہ کی اوٹ دے، دل کا حصار دے

یہ ریگزار، چار طرف آندھیوں کا شور
اس سرزمیں پہ آیۂ رحمت اتار دے

میں ہوں، تو اپنی سمت رہے گی مری پکار
تو ہے، تو اپنے رُخ سے نقابیں اتار دے

تو اپنے نقشِ پا کو مری سجدہ گاہ کر
اور آفتاب سے مجھے اونچا اُبھار دے

آئینہ ہو گئے ہو تو سیفیؔ یہ شرط ہے
آئینہ اعتبار میں خنجر اتار دے





کس کی جانب کوئی بازوئے شناور کھولے
خواب میں درد تمناؤں کے دفتر کھولے

سامنے آگ کا دریا ہو تو کیا تیرے کوئی
پاؤں پھسلا ہے جہاں چھت سے ترا، پر کھولے

دن ترے نام کی جپتا ہوا مالا نکلے
رات کی رانی تری زلفِ معنبر کھولے

دیکھیے یارِ طرحدار کا آنا کب ہو
ایک مدت سے کھڑا ہوں میں یہاں در کھولے

کیسے گزری ہیں مری دشت ختن میں راتیں
یہ معما ہے، صبا کھولے کہ آذر کھولے

مٹّھیاں بھینچ لی جیسے ہوں دلوں نے سیفیؔ
کوئی پروائی کہ سب گنبد بے در کھولے







سنگ پر کیا نام تھا زرتاب معیاروں کے ساتھ
آسماں کیا دیکھنے آیا تھا مہ پاروں کے ساتھ

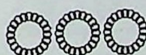
دل اگر مانے نہیں چپکے سے خنجر چوم لے
سر اگر سنتا نہیں ٹکرائے دیواروں کے ساتھ

پتھروں کے دیس میں آئینہ کیا کھولے زباں
پھول کب تولے نہیں جاتے رہے یاروں کے ساتھ

جب صبا کے نام لکھدی جائے خوشبو کی برات
زندگی کا نام ہوگا زندگی یاروں کیساتھ

جیسے میں نے آپ کو مطلق کبھی دیکھا نہ ہو
تذکرہ ہوتا رہا ہے آپ کا یاروں کے ساتھ

جب گذر جاتی ہے سیفؔی میرے آنگن سے صبا
کوئی تو خوشبو چمٹ جاتی ہے دیواروں کے ساتھ





ہاں گذرتا ہے اسی راہ سے فانی کوئی
کوئی آزر اسے سمجھا ہے، نہ مانی کوئی

پھول کانٹوں ہی سے اس دل کو زبان ملتی ہے
آسمانوں سے تو آتی نہیں بانی کوئی

دل گلابوں میں ہے لپٹا ہوا اس راہی کا
اور خوشبو میں تو ملتا نہیں ثانی کوئی

آپ کا نام لبِ گل سے ادا کیا ہوتا
آپ کا نام سنے دل کی زبانی کوئی

ایک بہتے ہوئے دریا میں کنول کھلتے ہیں
سیفیؔ پہچان تو لے رنگ ہے دھانی کوئی





مسکراہٹ کے فریب آنسوں کے دھوکے سارے
سہنے پڑتے ہیں مرے دل پہ کچوکے سارے
آج تنہائی میں آئینہ دکھا دوں تجھکو
بڑی مشکل سے تجھے پایا ہے کھو کے سارے
دیکھ کر چلنا کہیں پاؤں نہ پھسلے تیرا
راستے رکھے ہیں دریاؤں نے دھوکے سارے
وہی دریا سے گذرتا ہوا ہاتھی تو نہیں
جس کے ہاتھوں سے پریشان ہیں نوکے سارے
جھانک لیتا ہے دریچے سے وہی شہر کا اونٹ
کھا گیا باغ میں پودے جو کدو کے سارے

شام سے خالی ہے سیفیؔ قفسِ تنہائی
پھر سے کھلنے لگے وہ دیکھ جھروکے سارے





زندگی دریائے خوں سے تیر کر آنا پڑا
وادیاں دیکھا کئے ، صحرا بسر آنا پڑا

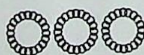
راستے میں جتنے پتھر تھے وہ دشمن ہو گئے
فاصلوں کی اوٹ میں آئینہ گر آنا پڑا

آنسوؤں کی بارشوں سے کچھ تو ہو سکتا نہ تھا
تجھ پہ رونے کے لئے جلتے نگر آنا پڑا

پار ہو جانے کی خاطر راستہ کوئی نہ تھا
تیز تھی شمشیر ، جس کی دھار پر آنا پڑا

آئینہ خانوں میں روشن ہو گیا عکس خیال
نغمہ بن کر یوں ہوا کے دوش پر آنا پڑا

وہ گھنے جنگل مری راہوں کو گم کرتے رہے
مجھکو خالی ہاتھ سیفی لوٹ کر آنا پڑا





تو ہی بتا کہ راہ میں کیسے ہو روشنی
وہ آندھیاں ہیں شمع جلانا محال ہے

ہاں بس اسی نے طاق سے ہیرا اڑا لیا
پہچان اس کی پھول سے چہرے پہ خال ہے

ہر آنکھ بے خطا تھی کہ وہ دیکھتی رہی
اس آئینے میں ہم نے بھی دیکھا کہ بال ہے

سیفی تمہاری بات کا مجھکو تو پاس ہے
آئینہ جڑ سکے گا مجھے احتمال ہے





عکس بجلی ہے ، لپک جائے گا آئینے سنبھل
لاکھ انداز نئے ہیں ، مرے احساس بدل
کیا کہا ایک بپھرتے ہوئے طوفاں سے کہیں
صحن سے تنکے اڑا لے ، نہ کوئی پھول مسل





اب صبا جا کر خبر لے آئے دریا پار سے
کس کی کشتی تھی جو کل ٹکرا گئی دیوار سے

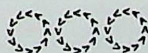
راستے میں جتنے بچھو ہیں وہ کاٹیں گے تجھے
باندھنا ہوگا یہ بازو پھول سا دستار سے

آئینے میں جتنے رنگ آئے وہ زائل ہوگئے
جانے پہچانے ہوئے گلشن لگے دیوار سے

کوئی کھڑکی سے ابھرتی شمع ہی گل کر گیا
کوئی خوشبو ہی اڑا کر لے گیا دیوار سے

ہاتھ جوڑے ہیں ابھی اس نے قلم کے سامنے
جو بہادر آجتک ڈرتا نہ تھا تلوار سے

تربتر ہے خون سے کس کے یہ نیزے کی انی
آپ تو سیفیؔ نظر آتے تھے کم آزار سے





ہر کھڑکی ہے ٹوٹی ہوئی سورج کے مکاں کی
صحرا میں تو پھر جیت ہوئی گشتہ سراں کی

سب حال ہے لکھا ہوا تتلی کے پروں پر
دیکھیں گے خبر لائیگا دل اور کہاں کی

اک راستہ جاتا ہے ادھر سے بھی یقیں کو
آؤ نہ کبھی سیر کریں شہر گماں کی

مٹتی ہوئی راہوں کے نشاں دیکھ لے سیفیؔ
قائم ہوں روایات جہانِ گزراں کی





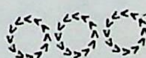
جنگلوں ہی کی خبر تھی، نہ پتہ کھائی کا
یہ سفر بھی تھا نتیجہ کسی کج رائی کا

پاؤں چھلنی کریں راہوں کے نکیلے پتھر
اور پھر بوجھ ہوا کاندھوں پہ تنہائی کا

دل سے ابھرے ہوئے طوفانوں کو آغوش میں لے
تم کو اندازہ تو ہو حرف کی گیرائی کا

کوئی بھی پھول نظر آئے، ٹھٹھک جاتا ہے
کچھ بھروسا ہی نہیں آئینے ہرجائی کا

شام چھیڑے تو لپک جاتی ہے دیپک سیفیؔ
رات جھلسے تو خیال آتا ہے پروائی کا





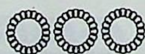
دل و نگاہ کو رکھ لیجئے زباں سے الگ
دیارِ گل کی مہک پھر مرے بیاں سے الگ

بندھا ہوا تھا اسی قافلے کے ساتھ مگر
خدا ہی جانے مرا دل ہوا کہاں سے الگ

برس نہ جائے گلوں پر کھلا کھلا سورج
زمیں نہ ہو کے رہے سرد سائباں سے الگ

گیا ہے وہ اگر چوٹی پہ پھر تعجب کیا
یہاں اک اور بھی سیڑھی ہے امتحاں سے الگ

خدا کرے کہ اجالا ہو رات بھر سیفیؔ
کوئی بھی شمع نہ ہوجائے درمیاں سے الگ





تاریک جہانوں سے کوئی تازہ سفر تھا
یخ بستہ پہاڑوں سے وہاں کس کو مفر تھا

جب نیلے سمندر پہ دھنک کھیل رہی تھی
اس روز سے تپتا ہوا صحرا مرا گھر تھا

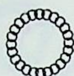
سب ہنس شبِ ماہ کی کشتی میں رواں تھے
ہر سمت بس آوازۂ گلبانگ سحر تھا

اس قید میں لگتی نہیں لوہے کی سلاخیں
بس نغمہ وہاں روزنِ دیوارِ نظر تھا

ہاں ترک بھی ہوسکتی تھیں ظلمت کی ردائیں
ہر لمحے کی تقدیر میں امکانِ سحر تھا

وہ رات صبا صحنِ گلستان میں رُکی تھی
سیفیؔ مرے آنگن میں بھی خوشبوؤں کا گھر تھا





آپ اور میں تھے فقط میرے خدا صحرا میں
کس کو معلوم ہے میں کیسے لٹا صحرا میں

میری آواز میں شامل تھی تمہاری آواز
میرا نغمہ جو کبھی گونج اٹھا صحرا میں

اس نے پہلے تو مرے دل میں اتارا خنجر
پھر تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا صحرا میں

میں بھٹکتا ہوں اندھیرے میں تمہاری خاطر
اپنے ہاتھوں سے کوئی دیپ جلا صحرا میں

حرف سورج پہ کسی طرح نہ آنے دینگے
رات کی بات نہ کر، چاند اُگا صحرا میں

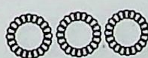
ریت کا ٹیلہ مقابل ہو تو آندھی بن جا
سیفؔی ہر ذرے میں طوفان جگا صحرا میں





کون پُل توڑ کے موجوں کو جگا دیتے ہیں
اور بیابانوں کو نقشِ کفِ پا دیتے ہیں
لوگ چپ کے سے بجھا دیتے ہیں پہلو کے چراغ
پھر بپھرتے ہوئے دریا میں بہا دیتے ہیں
یوں خزانوں کو چھپانا تو بہت آساں ہے
لوگ ۔ دیوار کھڑی ہو ۔ تو گرا دیتے ہیں
شہر اک ایسا ہے ، اجڑے ، تو فقط چٹکی میں
آپ اس شہر کو خوشبو میں بسا دیتے ہیں
نہیں ممکن کہ ہر احسان اتارا جائے
آپ خوشبو کے عوض پھول کو کیا دیتے ہیں

کبھی مانی سے بھی سیفؔی نہ چھپی جنبشِ خط
ہم جھلستے ہوئے صحرا کو صبا دیتے ہیں





کن بچھڑی گلیوں میں اکیلا سانجھ سویرے جائے
دل تنہائی کی نگری میں کیا کیا جوت جگائے

رات گئے تک تڑپاتی ہیں بیتے سمے کی یادیں
آہستہ بہتے دریا پر بید کے گھرے سائے

آنگن آنگن دیواریں ہیں اور مہکتے پھول
جن کی اوٹ میں سائیں سمندر خوشبو کا لہرائے

دل کے اس سنسان نگر میں روشنیوں کا کال
سورج چاند ستارے یوں تو سب میرے ہمسائے

روزن روزن سے خوشبو کا اڑجانا دیکھا ہے
حرف جو دل کا آئینہ ہے کیا کیا عکس چھپائے

یاد یاد کے آنچل سے خوشبو کا طوفاں اٹھے
دل کے ساگر میں مسکاتی قوسِ قزح لہرائے

اپنی بھول کے کارن سیفیؔ چھوٹ گئی ہے ناؤ
بادباں کھلتے دیکھے تو کیا کیا نیر بہائے





بچھڑ کے رہ گئے دریائے بیکراں ڈوبے
جو پتھروں کی طرح ہوگئے گراں ڈوبے

سراب نکہتوں ، آئینہ سرد جھیلوں میں
مہ تمام ستارے کہاں کہاں ڈوبے

زمیں پہ پھیلتی جائیں گلاب خوشبوئیں
پلک جھپکتے یہاں کتنے آسماں ڈوبے

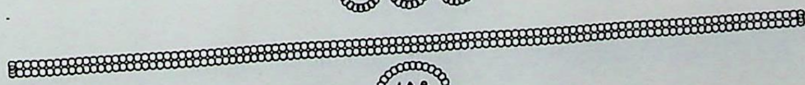
گہر سفینے ، سحر انبساط لمحے تھے
اسی بھنور سے ابھر آئیں گے جہاں ڈوبے

یہ موج موج مہکتے ہوئے نشان قدم
کٹے جو حق نگری میں وہ سر کہاں ڈوبے

اُفق اُفق سے اُبھرتی رہی تھی قوس قزح
شبِ سیاہ ترے دم سے ناگہاں ڈوبے

بچانے کے لئے اٹھی ہیں آندھیاں سیفیؔ
وہ دیکھ ڈوبتی کشتی کے بادباں ڈوبے







بیگانہ نگاہوں میں سنورنے کی ادا کیوں
سہتے رہیں ہم لوگ زمانے میں جفا کیوں

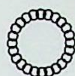
میں شہر سے بھاگ آیا ہوں صحرا میں چھپا ہوں
ہیں میرے تعاقب میں یہ نقش کف پا کیوں

اب کون اُفق پار سے آئے گا کبوتر
آندھی میں مرے نام کا خط پھاڑ دیا کیوں

شفاف ہو چشمہ تو دھواں کیسے اٹھے گا
روداد تمنا، سو اشاروں میں ادا کیوں

خود تونے ہی ظالم کو یہ خنجر تو دیا تھا
انصاف ہے سیفی کہ ترا خون بہا کیوں





آنکھ اُٹھانے کی سزا دیتے ہیں
آسمانوں سے گرا دیتے ہیں

پل گزرنے کے لئے ہوتا ہے
لوگ دکانیں سجا دیتے ہیں

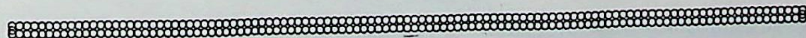
ہاتھ پہلو میں دبا کر چلنا
پھیل بھی جائے تو کیا دیتے ہیں

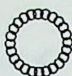
جگمگاتی ہوئی قندیلوں کو
مہبطِ غارِ حرا دیتے ہیں

در فصیلوں کے نہیں کھل سکتے
دل کے آنگن سے صدا دیتے ہیں

کوئی طوفاں ہو سفینے کھولیں
فیصلہ آج سنا دیتے ہیں

دل میں چبھتے ہوئے کانٹے سیفیؔ
کن بہاروں کا پتہ دیتے ہیں





اندھیارا ہر سمت رواں ہے آنکھیں کھول کے چلنا
پتھر پتھر دشمن جاں ہے آنکھیں کھول کے چلنا

وہ دیکھو آگے آتی ہے کتنی گہری کھائی
یہ تو سب سے بڑا امکاں ہے آنکھیں کھول کے چلنا

تو پوچھے تو میں بتلادوں اس کا نام پتا بھی
تو کاہے کو یوں حیراں ہے آنکھیں کھول کے چلنا

اب اس یخ بستہ چوٹی سے ہم کس راہ سے اتریں
ہر کوچے میں شورِ سگاں ہے آنکھیں کھول کے چلنا

ہاں ان بپھرے دریاؤں پر پل باندھیں تو اچھا
سب کے سر پر بارگراں ہے آنکھیں کھول کے چلنا

راتوں کی گہری تاریکی ہے نکّڑ پر سیفؔی
ہاتھ میں لے کر مشعل جاں ہے آنکھیں کھول کے چلنا





ہاں یقیں ہے، کہ مرے فرطِ گماں سے اُبھرا
آگ جس نغمے سے پھوٹی مری جاں سے اُبھرا

آئینے کو تیرے ہونٹوں سے شکایت، کیسی
کوئی تو خواب مرے حسن بیاں سے اُبھرا

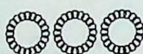
آ صبا، پھول کا سایہ تو ابھی رہتا ہے
یہ جو شیرین سا نغمہ تھا، کہاں سے اُبھرا

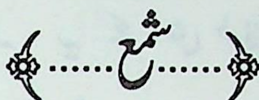
کوئی صورت تو مرے نوکِ قلم سے ٹپکی
کوئی نقشہ مرے اندازِ بیاں سے اُبھرا

اس کا کیا کیجئے کہ یہ بحر ہی طوفانی ہے
موج نے آن دبوچا میں جہاں سے اُبھرا

عین ممکن ہے کہ گلشن کو بہا لے جائے
ایک طوفاں کہ مرے شور فغاں سے اُبھرا

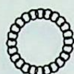
جی کرے ہونٹ ترے چوم لوں آ کر، سیفیؔ
نغمہ یہ لگتا ہے میری ہی زباں سے اُبھرا





شمع

میں نے اس شمع کو بجھنے نہ دیا
آندھیاں
در و دیوار کے سائے سے اُبھرتی رہیں
ایک آئینے پہ پتھراؤ ہوا
رنگ کی دیوار گری
دشت سے آہو بھاگے
دور ۔ سر شام ، مرے ہاتھوں سے
سوتے میں
نیلی ، بپھری ہوئی موجوں کے کنارے
وادئ دل کو مہکاتی ہوئی ۔
عطر گل ، نافۂ آہو ، خوشبو
سرک گئی
میں نے اس شمع کو بجھنے نہ دیا
اب سر شام وہی ۔ ایک بڑے پتھر کو
کھینچ رہی ہے ، تنہا



جل اٹھے پھول کہ پھیلا کئے صحرا لوگو
ساتھ سائے میں سنورتے رہے دریا لوگو

ہاتھ پتوار سے لگ جاتا کہ طوفاں اٹھا
آگے ساحل پہ تو تھا شہرِ تمنا، لوگو

ناؤ گرداب میں آجائے تو حیرانی ہے
دیکھنے آتے ہیں ملّاح تماشا، لوگو

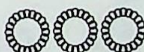
بارشِ سنگ ہوئی ایسی خدا خیر کرے
تربتر خون سے ہے میرا سراپا، لوگو

شہر کا شہر نکل آیا تھا پتھر لے کر
ہونٹ کیا کھلتے کہ آنکھوں کا تھا پہرا لوگو

شور اتنا ہے کہ آواز قفس میں ڈوبے
ہم کہاں تک رہیں اس طرح سے تنہا لوگو

تم کہیں دور نہیں ہو کہ خبر ہی نہ لگے
میرے دل کا جو نکل آئے مداوا لوگو

ہم پہ طوفانوں کا گھیراو رہا ہے سیفؔی
بس اُبھرتے ہیں ذرا دیر ٹھہرنا لوگو





شمع کی طرح بجھا تا ہے ، خدا جانے کیوں
دل کبھی ٹوٹ سا جاتا ہے ، خدا جانے کیوں

منہ چھپائے ہوئے گزرا ہے مرے آگے سے
میرے گھر بھی نہیں آتا ہے ، خدا جانے کیوں

دن کو تنہائی کا احساس کچلتا ہے مجھے
شب تری یاد دلاتا ہے ، خدا جانے کیوں

بیچ آیا ہے اندھیرے کے عوض آنکھوں کو
اب مجھے راہ سجھاتا ہے ، خدا جانے کیوں

اپنے دستار کو طُرّے کے عوض رہن رکھا
مجھکو آداب سکھاتا ہے، خدا جانے کیوں

ایک بار آکے مرے حال پہ ہنس جاتا ہے
مجھکو سو بار رُلاتا ہے، خدا جانے کیوں

کھڑکیاں بند کر آتا ہے یہ بیری پالا
برف سے راہ چھپاتا ہے، خدا جانے کیوں

ایک دل سینے میں چپ چاپ دھڑک اُٹھتا ہے
سیفیؔ تنہائی میں گاتا ہے، خدا جانے کیوں





آئینے کے پردے میں اگر ہم نہیں ہوتے
شایان طرب آپ کے موسم نہیں ہوتے

اس راہ میں تیرے بھی تو پاؤں کے نشاں ہیں
اب موردِ الزام بس اک ہم نہیں ہوتے

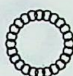
شفاف ہے یہ جھیل انہیں کیسے بتاؤں
خود اپنی نگاہوں کے جو محرم نہیں ہوتے

دل حرف کو فولاد کی شہتیر بنا دے
پُل برف سے بنتے ہیں تو محکم نہیں ہوتے

یادوں کی یہ وادی تو چناروں سے سجی ہے
غم، ایسے بھی سائے ہیں، جہاں کم نہیں ہوتے

بجھتی نہیں، پھر کیسے بجھائے کوئی، سیفیؔ
من میں جو لگے آگ تو برہم نہیں ہوتے





شاخوں پہ نظر آئے تھے دمساز بہت کم
صحراؤں سے رہتی مری پرواز بہت کم

آئینے اُڑا لے ہی گئے درد کی روداد
آندھی پہ کھلا کرتے مرے راز بہت کم

ہاں ایک گلابوں کی مہک ساتھ رہی ہے
دیکھے ہیں صبا میں ترے انداز بہت کم

ہاں رقص کیا کرتی ہے سن کر جسے ناہید
گونجی ہے ترے دل میں وہ آواز بہت کم

بچ کر تو نکل سکتا نہیں اب کوئی پنچھی
سوتا ہے مرے ہاتھ کا شہباز بہت کم

ہر تیرِ نگہ تشنہ سخن پیرہنی کا
سیفیؔ کو ملے تھے یہاں غمّاز بہت کم





یہ مہکتا ہوا دریا گزراں ہے کہ وہی ہے
بید کے سائے پہ جنت کا گماں ہے کہ وہی ہے

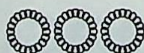
دل یہ کہتا ہے گلابوں کی سی خوشبو تو اڑی تھی
پھول اُٹھ اُٹھ کے یہ پوچھے ہے کہاں ہے کہ وہی ہے

جھیل سے چلتی ہوئی سوندھی ہوا لُٹتی رہی ہے
اک سفینہ سا بہر سمت رواں ہے کہ وہی ہے

رات اک شخص چنبیلی کی طرح بول اُٹھا تھا
تو نے صحراؤں سے پوچھا تھا تو عیاں ہے کہ وہی ہے

گھپ اندھیر ہے تو یہ خوف کہ سورج نہ اُبھاریں
دل پہ ہر شخص کے یہ بارگراں ہے کہ وہی ہے

خوں بہاتا ہوا اس راہ سے گزرا تو ہے سیفیؔ
کوئی شاید پس پردہ نگراں ہے کہ وہی ہے



......تصویر......

دھیرے دھیرے آئینے میں عکس آئے گا
دُھندلے دُھندلے نقش
اُبھر کر
پھول بنیں گے

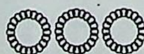
خوشبو سے سیرابی ہوگی
قطرہ قطرہ دریا ہوگا
جسمیں
کنول کھلتے جائیں گے
باد صبا میں
لہرائیں گے
---تم آؤ گے





پھول جو دل نے چھپایا ہے جانا پہچانا ہے
رنگ جو خوشبو پر آیا ہے ، سب نے مانا ہے
جونہی وقت نے پاؤں تلے سے سیڑھی کھینچ نکالی
جان گئے تھے کیا کیا ، آشا پر لٹکانا ہے
دھیرے دھیرے بہتے دریا کیا سندیسہ لائے
میں خوشبو لایا ہوں کیا مجھکو پہچانا ہے
لُنڈ منڈ پیڑوں کے پٹ سے رُت پھولوں کی جھانک
دیکھ بدلنے کو دیوانے سے ہر سیانا ہے
پھیکے پھیکے سانجھ سویرے بیکل بیکل راتیں
دل آنکھوں میں ڈوبے ، آنسو کو بہہ جانا ہے
سارے بدھی مان سمے کے ، وقت کے دانشور
آگ سے کھیلنے والوں کو اب کیا سمجھانا ہے

برف کو چھولیں دھواں لپیٹے آگ کے شعلے سیفؔی
محل ہماری سندر دھرتی کا ڈھے جانا ہے





ہانپ رہا ہوں کانٹے ہیں پاؤں میں
گیسو کھول کہ آجاؤں چھاؤں میں

پیاسا خالی چھاگل لے کر لوٹا
خشک ہوا ہے پانی دریاؤں میں

اب اس راہ سے کون چلا آئے گا
شام ہوئی جاتی ہے آشاؤں میں

دُھوپ کُھلے تو یخ بستہ موسم کو
پھولوں کی یہ مالا پہناؤں میں

تنہائی آگے سے بند گلی ہے
اس سے آگے اور کہاں جاؤں میں

سندر بن میں خوشبو پھیل گئی ہو
اور اسی خوشبو میں کھوجاؤں میں





دل کا سکوں ، چاند رات ، آبِ رواں ہے
دیکھ ، سرِ دار حسن کار جہاں ہے

دل گہرِ پاک ، رنگ وقت و مکاں سے
سوچ فقط اعتبار کار زیاں ہے

کس سے کہیں امن امن کس کو لُتاڑیں
اچھے اصولوں کے ہاتھ کارِ جہاں ہے

راہ پھسلواں ، رات ، اور سنبھل جا
سلسلۂ سانحات ، بارِ گراں ہے

دھوپ ، نری آگ ، حبس ، ہانپتا پنچھی
بھول کہیں آس پاس شعلہ بجاں ہے

تیر نگہ کوہ کاف سنج ہے سیفیؔ
چشم زدن امتیاز دورِ زماں ہے





کوئی مفہوم نہ شب کا ہوگا
مرحلہ رنج و تعب کا ہوگا

فیصلہ ہو بھی چکا ہے صادر
اُن کی آنکھوں پہ تو کب کا ہوگا

حرف اور عکس کے آئینے میں
فاصلہ حدِ ادب کا ہوگا

کچھ شکایات گلوں کی ہونگی
کوئی دعویٰ تو عنب کا ہوگا

خون میں ڈوبے ہوئے سرتاپا
ہاں یہی حال تو سب کا ہوگا

آگے پیچھے ہیں عدم کے سائے
لمحہ سیفیؔ تو طرب کا ہوگا









اشک موضوع مری تنہائی کا
حرف سایہ ہے کسی رعنائی کا

کوئی آساں تو نہیں ہاں کہدینا
امتحاں درپیش ہے برنائی کا

سوچ کے صحرا کو کیسے پھاند آئے
آئینہ کیسے جڑا عذرائی کا

ٹوٹنا تو تھا، گھڑا مٹی کا تھا
ہم کو اندازہ بھی تھا گہرائی کا

خون سے تحریر کرنا سیفیؔ کا
قرض صحرا پہ نہیں پہنائی کا





خدا کرے نہ سفینوں کا کارواں ٹوٹے
وہ آندھیاں ہیں کہ ان گنت بادباں ٹوٹے

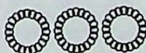
گلی گلی سے اُبھرتے رہے ہیں پھر طوفاں
کسے خبر ہے کہ کب سر پہ آسماں ٹوٹے

بتاؤ ، کیسے اتر سکتے تیرے شہر میں ہم
یہ پل - تری ہی خطا ہے - جہاں جہاں ٹوٹے

ورائے حدِ نظر ایک داغ سا محمل
مگر یہ شرط ، نہ ہمت کا سارباں ٹوٹے

بہت قریب سے چھوٹا ہے دامنِ امکاں
بس ایک ہاتھ تھا جب پائے نردباں ٹوٹے

بچا سکا نہ کھلی بستیوں کو اولوں سے
ہزار چھید سے سیفیؔ یہ سائباں ٹوٹے





مرے دشت کا جو غزال ہے، اسے دیکھنا
کسی موقلم کا کمال ہے، اسے دیکھنا

یہ جو موتیوں کی بساط ہے نہ اتر یہاں
یہاں چپے چپے پہ جال ہے، اسے دیکھنا

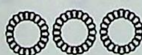
گھنے جنگلوں کی توساکھ راکھ کا ڈھیر ہے
کہ لپکتا شعلہ خیال ہے، اسے دیکھنا

کوئی خوشبوؤں کے سراغ میں سرِ دار ہے
مری زندگی کا سوال ہے، اسے دیکھنا

کہ جواب ہے تری شعلہ بار نگاہ کا
وہی سیدھا سادا سوال ہے، اسے دیکھنا

یہ گلوں کے ساتھ جو رنگ رنگ کی بات ہے
کہیں آئینے ہی میں بال ہے، اسے دیکھنا

ہے نظرفریب جو سیفیؔ وہم و گمان بھی
نہ ہو آنکھ ہی تو محال ہے، اسے دیکھنا





نہ راہوں سے کوئی لوٹا نہ پل بھر نیند آئی
مری تنہائیوں میں جھانکتی جلتی خدائی

اتارے جاتے ہیں خاموش دل میں تیز چاقو
بدل سکتی ہے آساں دشمنی میں آشنائی

پہاڑوں سے اترتا تیز دریا سامنے ہے
مجھے جو پار لیجاتی وہی کشتی نہ آئی

ہوا کے دوش پر دھیمے سروں کی لے اُٹھی ہے
زمیں سے اُٹھتی خوشبو کی کشش ہے سیمیائی

پر پرواز میں چُبھتی ہوئی فولاد کیلیں
گلستان سے گزر ہے اور قفس کی یاد آئی

ہر اک احساس کے کانٹے نے دل پر نام لکھا
حساب اپنا درست آتا رہا ہے آ نہ پائی

ذرا اس بے محابہ ٹوٹتے صحرا سے پوچھیں
خزانے کیا تھے جنھوں نے یہاں دیوار پائی

مقابل ہو کہ سیفؔی تیرے خدوخال اُبھریں
کہ مدت بعد آئینوں میں ہوتی ہے صفائی





حسن کا معیار کُھلتی سادگی ہے یاد رکھ
پھول کے مفہوم ، خوشبو ، پر نئی بنیاد رکھ

وسعت صحرا میں اُڑتے سُرخ رہواروں کا غول
لذت مشکِ نفس آوارگی آباد رکھ

ماورائے رنگ و بو دھندلاہٹیں ہیں سوچ لے
بوجھ کاندھے سے لگا اگلا قدم میعاد رکھ

روشنی کا دائرہ اترا تو ننگی کھائیاں
حرف کی شیرینیوں میں کرب کی فریاد رکھ

دیکھ آگے کی طرف کشتی کو سیدھے رُخ چلا
توڑ سب زنجیریں اپنے آپ کو آزاد رکھ

چاند جوئے آب میں آیا ہے ، تارے پر نظر
آرزو اک سر پٹختی موج ہے دل شاد رکھ

پاؤں میں چھالے ہیں، سیفی، رنگ صحرا میں نہاں
بات اپنوں کی چلی ہے نشترِ بیداد رکھ





عکس بجلی ہے لپک جائے گا آئینے سنبھل
لاکھ الجھاؤ نئے ہیں مرے احساس بدل

کیا کہا ایک بپھرتے ہوئے طوفاں سے کہیں
صحن سے تنکے اُڑا لے نہ کوئی پھول مسل

کیمیا گر تو رہا کرتے ہیں بازار سے دور
کیمیاگر سے ملادوں گا مرے دشت میں چل

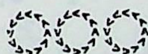
موقلم دیکھ لے سب رنگ ہیں گہرائی میں
بوئے گل جوہرِ اِعجاز تو انداز غزل

بس ذرا دیر میں وہ آنکھ بدل جاتی ہے
تیری جانب جو وہ اٹھی ہے تو اتنا نہ اُچھل

کھو گیا سونے کے جنگل میں چکاوک اپنا
باز صحراؤں کے عادی ہیں کھلونے سے بہل

دھوپ ہے تیز برستے ہیں برابر شعلے
وادیٔ دل میں نہ گُل سوکھ چلیں چشمے اُبل

راہیں کس درجہ پھسلواں ہیں اب کے سیفیؔ
رنگ خوشبو کی طرح پھیل رہا ہے نہ پھسل





تم کو تو وہ دن یاد ہے ۔ آغازِ سفر تھا
نکہت کا ہی وہ شہر تھا جسمیں مرا گھر تھا

اب کہتے ہیں تاریکی کے بادل نہیں چھٹتے
ہر ثانیہ امکان میں پابندِ سحر تھا

کیا کوئی گلی ہے کہ جہاں روزن دیوار
اوروں کی طرف اُٹھتی نگہ کا نہ اثر تھا

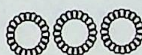
پھولوں سے الجھتی تھی ہوا چھان پھٹک کی
ہر سنگِ سیہ تشنۂ پازیبِ ہنر تھا

وہ میں ہی تو تھا جس پہ پڑی تھی تری بجلی
شبنم سے خیالوں کی مہک تھی گلِ تر تھا

تقدیس کی اُٹھتی ہوئی دیوار کا سایہ
پھولوں سے نہاں خون کے دریا کا گزر تھا

تم جانو کہ انساں کا دل یوں نہیں کھلتا
چٹان میں دیکھا تھا کئی بار کہ در تھا

گلشن کی یہ تصویر بھی اچھی رہی سیفیؔ
سرسبز جسے کہتے ہیں وہ رنگ کدھر تھا





ماتھے پہ نمودار لکیریں نہ جتانا
قسمت کی اگر پوچھے فقط ہاتھ دکھانا

جل اُٹھے تو پھر دل کا دیا بُجھ نہیں سکتا
مشکل تو مری جان ہے یہ شمع جلانا

کاندھے ہوں گراں بار تو جھکنا نہیں ہرگز
ہونٹوں پہ تبسّم لئے ہر بوجھ اُٹھانا

تصویر میں کچھ رنگ بھروں میں تری خاطر
گرتا نظر آتا ہے مکاں ہاتھ بڑھانا

تو جانے جو دل ٹوٹے تو پھر کیسے جُڑیں گے
ذرّوں کو بکھرنے کے لئے ایک بہانا

طوفاں میں سفینے ہیں تو تھم جائیں گے طوفاں
آساں جو نہیں آندھی سے دیوار بنانا

اب آؤ مہکتی ہوئی دیوار بنائیں
گل ،سیفیؔ، ہیں ہر سمت کبھی بھول نہ جانا



......مہک !......

چوٹی
جس نے سر پہ اُٹھا رکھی ہے
جھیل ،
کہ جس میں نیل کمل کے پھول کھلے ہیں
جس کی فضاؤں سے تیری خوشبو آتی ہے
جسمیں سونے کی اک کشتی
بادباں جس کے بگلے کے پر ہیں ۔ رواں ہے
جسمیں پیار کا اک فرشتہ
بیٹھا
تیروں سے دل جوڑ رہا ہے
تیرے دوار آئے
تو صبح کی نرم ہوا کے جھونکوں سے کہہ دینا
اب وہ کہاں ہے۔





نگاہ کا کبھی پرچم کھلا ہے نافہ قبیل
صبا کے ہاتھ سے نکہت پہ باندھنی ہے فصیل

سبب تبسّمِ عالی کا ہے طباقِ گہر
گلاب کے لئے کوئی نکل سکی نہ سبیل

فلک سے جھانکتے تارے بس اک تو ہی تو نہیں
ہر ایک دل میں جگاتا رہا نفس قندیل

رکو اگر تو نگاہوں کے زاویہ پرکھیں
سمجھ سکو تو نہیں داستان بھی اتنی طویل

پلید کیڑے ہیں جن کا نصیب ہے جھاڑی
چنار سایہ فراخی میں کون تیرا عدیل

اندھیری راہوں میں سیفیؔ چراغ تیرے ہیں
سکوت میں بھی گلستان ہے صاحب ترتیل



صحرا صحرا.....!

لُنڈ مُنڈ ۔ اک پیپل تنہا
چوٹی پر سے دیکھ رہا ہے
وادی میں بہتے دریا کو ۔
پھول
مہکتا سبزہ
خوشبو ۔

جنگل جنگل پھول کھلے ہیں
جن کی مہک سے
مست صبا کی گردش جاگے





کشش ، طلب کا ترنم ہے ، آبشاروں میں
شفق بسیط رہی تا سحر بہاروں میں

ورق ورق پہ گلوں کے لکھے ہیں نام اُنکے
کہ آگے آگے تھے احباب سنگباروں میں

بس اک صبا ہی نہیں نکہتوں میں سرگرداں
ہمارا نام بھی لکھ لیجے بیقراروں میں

گزرتی صدیوں کی فریاد بھی ہے خوشبو میں
زمانہ ۔ حرف کا آئینہ ۔ شاخساروں میں

اُجالا ہے کہ دلوں کے چراغ روشن ہیں
سیاہیاں تو اُچھلتی رہی ہیں غاروں میں

اُتر رہے ہیں ثُریا سے اب زمینوں پر
کس اہتمام کے چرچے ہیں شہر یاروں میں

ہے میرے نام سے سیفیؔ قلم کی شب خیزی
نگہ کا حسن جھلکتا ہے جاں سپاروں میں



......نہایت اسکی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ......

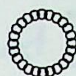
زمانہ جس کے لئے اشک بار ہے پیہم
زباں پہ ذکر ہے جس کا بانتہائے الم
وہ سرفراز جو آغوش فاطمہ میں پلا
رکھے تھے جس نے کبھی دوش مصطفٰےؐ پہ قدم
وہ جس نے راہ خدا میں لٹا دیا سب کُچھ
حسینؓ ابن علی فخر دودۂ آدم
وہ حق شناس جو باطل کے سامنے نہ جھکا
رہا ہمیشہ جو اللہ کے سامنے سرخم
وہ راہ حق میں شہیدوں کا قافلہ سالار
بلند جس کا رہا رزم کربلا میں الم
وہ شیر دیکھ کر جن کو لرزتے تھے اعدا
کہیں مصاف میں جنکے اُکھڑ سکے نہ قدم
وہ صلح جُو نہ تھی جن کو مبارزت مقصود
وہ جن کی ذات پہ ڈھائے گئے ستم پہ ستم
جو ہنس کے جان پہ کھیلا وہ مومن اکمل
"غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم"

بلبلیں

آج کچھ نہیں کرنا۔۔۔
آج ہم یہ دیکھیں گے یاد کے میہماں خانے میں
کون کون آتا ہے
پھول کون لاتا ہے۔۔۔

کن فراغ لمحوں کی خوشبوئیں بکھرتی ہیں
جھٹ پٹی فضاؤں میں پھیل پھیل جانے کو
روح کو جگاتی ہیں،
اور لوٹ جاتی ہیں
دیر تک نہ آنے کو۔۔۔





آئینہ بھی ہے ، گلاب بھی ہے
خوشبوؤں کا انتخاب بھی ہے

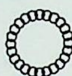
سر جھکتے ہی لہر لہر ڈوبے
پیاسا ہے وفور آب بھی ہے

آرزو کی نگاہ کا تجسُّس
مانی کے قلم کا خواب بھی ہے

معنی کے لبوں کا ہے تبسُّم
اسرار میں باریاب بھی ہے

ترتیب سے رکھنے کو دھندلکے
حیرت ، سیفیؔ ، جواب بھی ہے





یہ سرد ، لمبی ، سکوں سے عاری سیاہ راتیں
ردائے خوں اوڑھ آئیں بے انتباہ راتیں

وہ دیکھ لے کون اپنے پیچھے بکھیرتا ہے
حریف اندھیارے ، تا بحدِ نگاہ راتیں

کنول کنول آفتاب صورت چمک اُٹھا ہے
سہار سکتی نہیں وِ تستا سیاہ راتیں

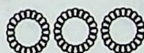
ادائے توقیر حُسن تمکیں سے رقص فرما
شفق کے پیچھے سے جھانکتی کجکلاہ راتیں

چراغ بنتے چلے گئے راستوں کے پتھر
نہ بھول جانا کہ دن ہے منزل تو راہ راتیں

یقین کیسے کرے سیاہی کہ پو پھٹی ہے
پہنچ تو آئی ہیں اس کے گھر اشتباہ راتیں

اس آئینے میں تو عکس پتھر پہ نقش ہیں سب
صبا کی خوشبو میں ڈوبتی ہیں اتھاہ راتیں

سحر کی کھڑکی سے جھانکتی آندھیاں ہیں سیفیؔ
اُفق سے اڑنے لگیں برنگ گیاہ راتیں





مت جان ، ارادے کی خطا کم سخنی ہے
وہ کرب مسلسل ہے، مری جاں پہ بنی ہے

ہر جھیل کی تہ میں وہ نظر نغمہ سرا ہے
گہرائی کی مہکار میں سر گلبدنی ہے

سنگ آئینگے ، پھول آئینگے ، دیکھے گا زمانہ
سر پر مرے اعمال کی چادر جو تنی ہے

خوشبو کا تقاضا تو ہوا دار کا ہمدم
پھولوں کی تمنا ہدفِ سنگ زنی ہے

یادوں کے جھلستے ہوئے صحرا میں ہیں چشمے
سرسبز چناروں کی جہاں چھاؤں گھنی ہے

پھولوں کا حسیں شہر ہے چپ چاپ گزر جا
حرف ہاتھ جو پھیلائے سزا دل شکنی ہے

آندھی مری خاطر سے خزانے بھی اُٹھا لائے
جھکتا ہی نہیں دل کہ ارادے کا دھنی ہے

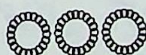
شیریں کے لئے خون اناروں کا ، ضمانت
فرہاد کا آئینِ وفا کوہکنی ہے

ہر لمحہ جو دریا کی طرح لٹتا رہا ہے
کیا چھنتا ہے اس ہاتھ سے جو دل کا غنی ہے

یہ دشت سفر ، درد کا تپتا ہوا دریا
یادوں کے کنارے تو بہت چھاؤں گنی ہے

آئینے سے گزری تو دھنک روپ سے اُبھری
وہ ایک نگہ جو مری پہچان بنی ہے

سمت گر اپنی طے نہیں ہو پاتی ہے سیفیؔ
دیکھیں گے کہ راہوں کی خطا راہزنی ہے





پھول صحرا کو بہاروں کا خدا ہی دے گا
دشت کو آب ترا آبلہ پا ہی دے گا

راکھ بن بن کے نہ اُڑ جائینگے انبار گیاہ
سوچ کو عزمِ سفر شعلہ نگاہی دے گا

آ نہ پائی ہے درست شوخ اداؤں کا حساب
دل میں کھلتا ہوا ہر پھول گواہی دے گا

ہر دوراہے کی زباں خونِ جگر مانگے گی
کسی خوشبو کا پتا راہ کو راہی دے گا

سوچ وہ شب کہ ترنم کو بھلادیں گے ساز
کھوج وہ ثانئے سورج بھی سیاہی دے گا

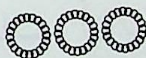
نقش بر سنگ ہے افسانہ ، خموشی تجھکو
کون اس راہ سے گزرا ہے، بتا ہی دے گا

بات،بھونچال کی صورت میں، ہلا دیتی ہے
دل سے کہدو تو مرا کام بنا ہی دے گا

پُل بنائے گا تو چوڑائی میں تلوار کی دھار
دل مجھے آگ کے دریا میں جلا ہی دے گا

خط سے پوچھیں گے تحیُّر کا سزاوار ہے کون
آئینہ بڑھ کے مرا نام بتا ہی دے گا

حرف، احساس کی تصویر کشی میں ، سیفیؔ
حسن کا راز زمانے کو بتا ہی دے گا





بیستوں کاٹنے سے پیار کیا
سنگ کو ساغر انار کیا

میں کڑی دوپہر کا سایہ چنار
میری شاخوں پہ کس نے وار کیا

شاخِ طوبیٰ سے کاٹ لی کشتی
سات دریاؤں کو سوار کیا

بھر کے دامن میں پھول خوشبوئیں
ہم نے آندھی سے کاروبار کیا

چشمہ پتھر کو توڑ کر نکلا
گل نے خوشبو کو آشکار کیا

یہ تھپیڑے یہ ٹوٹتے مستول
تو نے طوفان کو کیسے پار کیا

آئینے پر وہ دھند چھائی ہے
دل نے صحرا میں انتظار کیا

چاند تک کیسے پہنچتے سیفیؔ
گرتی سیڑھی پہ اعتبار کیا





بید سایہ گل آئینہ ہوگا
جھیل خوشبوئیں مجھے جینا ہوگا

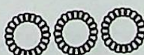
دیکھ نرگس تری وادی منگل ہے
سوچ صحرا کہیں آدینہ ہوگا

راہ سے نقشِ کفِ پا مٹتے ہیں
جادہ پیما ہی کوئی بینا ہوگا

رنگ سے ہٹ جا اتر گہرائی میں
کھول آنکھیں سامنے سینا ہوگا

کوئی بچہ کسی آنگن میں رویا
کوّے نے ٹکڑا چھینا ہوگا

پھول کا سونا کسوٹی ہے سیفؔی
زہر کا پیالہ پینا ہوگا

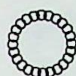






بیل ہے انگور کی دریا رواں ہے
میں تو سایہ میں کھڑا ہوں، دل کہاں ہے
خوشبوؤں کے دیس سے آیا ہے تن کر
سر پہ یادوں کا سنہرا سائباں ہے
حرف جس میں دل کھڑا ہے نور پیکر
ہاں نظر کے سامنے روشن، جہاں ہے
میں، تری خاطر سے، تہ تک جارہا ہوں
گھپ اندھیرا ہے، کوئی موتی نہاں ہے
جنگلوں سے شہر گڈ مڈ ہو رہے ہیں
دھند میں یکسر بھٹکتا کارواں ہے
آندھیاں ہیں قطرے قطرے میں بھنور ہیں
ناؤ میں سوراخ ٹوٹا بادباں ہے





یوں نگاہوں سے کئی سرو رواں گزرے ہیں
دل کہ مجنوں ہے ترا ہی قدِ دلجو مانگے

کتنے ہی لعل و گہر خاک ہوئے راہوں میں
وہ بھی تو ہے کوئی موتی جسے تو مانگے

سایۂ گل کو بتا دے کہ وہ خوشبو کیا ہے
جب کوئی سوختہ جاں سایۂ گیسو مانگے

آسماں تجھکو خبر ہے تو بتا دے مجھکو
سنگ خارا ہو تو کس طرح کا جادو مانگے

شہر کے شہر یہاں کیا نہیں مانگتے آئے
میرا سوپور تو سیفی سا سُخن گو مانگے





شبیہوں پر مسلط تیرگی ، بے آسرا ہے
دلوں میں پھیلتی اظہار کی خوشبو، ضیا ہے

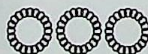
مجھے لگتا ہے آنکھوں کے سبو محفوظ کرلیں
میرے کاندھوں پہ غم کا بوجھ ، پیر تسمہ پا ہے

یہ آئینہ رہا ، شاید تری پہچان جاگے
سماں بجلی صفت ہے ، تیرا چہرہ کونسا ہے

کوئی آواز ہو ، چمپا کی خوشبو بن کے آئے
کہ وادی اب گرجتے آبشاروں کی صدا ہے

دل اس چشمے تک آتے کیسے صحراؤں سے گذرا
قلم تو کہدے ، تُو تو عمر بھر کا آشنا ہے

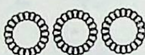
سفر کی کوئی منزل بھی ہوا کرتی ہے سیفیؔ
جہاں پہنچا سمجھتا ہوں یہیں سے ابتدا ہے



......دور کی باتیں......

اس دیوار سے ٹیک لگا کر
نیلے کبوتر نے
فولادی گنبد کا دروازہ کھولا تھا
اور خود اس میں آن بسا تھا
جھیل کا شیریں پانی
سوراخوں کی راہ سے، برس کر
بہہ نکلا۔۔۔پھر ہاتھ نہ آیا
ندی۔۔۔ یوں تو
ریت کے جلتے صحراؤں میں ڈوب گئی ہے
چشمہ خشک ہوا جاتا ہے

آئینوں میں ابھی چمک ہے
اور مُدھرتا بول رہی ہے
اب اک سانپ نے
فولادی گنبد میں آکر
اپنا مسکن۔۔۔۔۔۔ڈھونڈ لیا ہے
میں یہ پستک بھول چکا ہوں
دور کی باتیں۔۔۔
شاید!





پروں کو شوخ نگاہوں کا حوصلہ دینا
تم اُڑتے رہنے کو اپنا قفس بنادینا

نیا نیا چلا آیا ہوں اپنی بستی میں
میں اجنبی ہوں مجھے راستہ بتا دینا

یہیں وہ سبز جزیرہ ہے آس پاس کہیں
اسے مہکتے ہوئے اپنے نقش پا دینا

ترے مکان کی چھت مدتوں سے برسی ہے
خود اپنی سوچ سے اک گھر نیا بنا دینا



اسی خرابے میں دیکھنا اپنی شام ہوگی
وہ خوف برسے گا نیند سب کی حرام ہوگی

نکل پڑا ہوں ، مرے خطوں کا خیال رکھنا
ہر ایک چٹھی یہاں فقط میرے نام ہوگی

اُگل رہے ہیں ہمارے ہی نقش پا اندھیرے
دیئے جلائیں کہ روشنی پھر سے عام ہوگی

درخت ، میں مانتا ہوں ، تونے لگا دیئے ہیں
نہ مانگ سایہ ، کہ یہ توقع ہی خام ہوگی

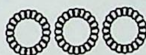
یہ غار، ذرّات کا جگر چیرتی شعاعیں
نگاہ کی بات بات ذُوالاحترام ہوگی

ابھی وہ برگد جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا ہے
اسی کی شاخوں میں سب پرندوں کی شام ہوگی

خلوص کے پھول، پیار کی خوشبوئیں کہاں ہیں
کبھی چمن میں صبا تو محوِ خرام ہوگی

کبوتروں کا جہاں ، غٹر غوں کے نغمے سیفؔی
وہ دن کہ بلّی نہ پھر کہیں زیرِ بام ہوگی

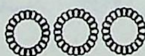
۳۰ اگست ۹۲





کھلتی گئی تصویر ہوئے چشم کشا راز
بدلے رُخِ آئینہ ، بدل جاتے ہیں انداز
گرتی ہوئی دیوار ، لڑھکتے ہوئے پتھر
ہم اپنے سفر کا تو کہیں سے کریں آغاز
یہ جھیل ہے جھیل اپنی فلک اپنا فلک ہے
وہ دیکھ حسیں دائرہ اُڑتے ہیں مرے قاز
شیریں کے تبسم سے ہوا گرد دماوند
فرہاد کے تیشے درِ خارا نہ ہُوا باز
ہر جھیل کی تقدیر کنول ، پھول کی خوشبو
ہونٹوں پہ تبسم ہے مہکتا ہوا اعجاز

کیا بات مجھے مجھ سے چھپاتی رہی سیفیؔ
وہ جاگ اُٹھی میری زباں پر مری آواز





سلگتے دشت سے باد صبا بھی چلتی ہے
چھلکتے آنسو ، کڑی دوپہر بھی ڈھلتی ہے

فریب رنگ دے، خنجر کا روپ، خوشبو کو
نگہ مصاف میں سو پینترے بدلتی ہے

جواب ہو کے جھکے گل صفت مہکتی ہے
سوال ہو کے اُٹھے آئینے میں ڈھلتی ہے

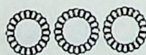
یہ اور بات کسی دیدہ ور کے ہاتھ لگے
کٹی پتنگ ہواؤں کے سنگ چلتی ہے

وہ لُو چلی کہ گلشن کے ہونٹ سوکھ گئے
وہ شعلگی ہے سمندر کی کوکھ جلتی ہے

سحر کھلے پہ جھپٹتا ہے شام کا آنچل
ہوا چلے پہ چراغوں کی لو مچلتی ہے

کہاں سے آگئی خوشبو غزل کے گیسو میں
گلوں کی چھاؤں میں یہ شہزاد پلتی ہے

اُجالے مفت میں سیفیؔ ہوا نہیں کرتے
اُٹھائے شعلہ جو سر پر تو شمع جلتی ہے



آ ...... خوشبو ......

تیرے در پر دامن پھیلائے
آیا ہوں ------- دل بھرا دریا ہے
دور ------- ہوا میں
اُڑتے وحشی گھوڑے
سرخ بہاریں
ہاتھ نہ آئیں
------ خوشبو
ہم یہ دیواریں ڈھا کر رکھ دیں
صحرا بن جائیں

۲۶ مارچ ۱۹۹۴





نگہ نگہ میں تُلے حسنِ انتخاب مرے
کن آفتوں میں سنورتے رہے تھے خواب مرے

تمام عمر کسی نے مجھے نہیں دیکھا
مجھے چھپاتے رہے مجھ سے بھی نقاب مرے

کہیں گلاب کہیں آئینہ کہیں موتی
تری نگاہ میں جچتے نہ تھے سراب مرے

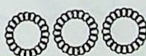
"بس ایک صفر پریشانیوں کا باعث تھا
کھلی جو آنکھ تو بڑھتے رہے حساب مرے"

ہمیشہ سے تو یہی طور تھا نگاہوں کا
گناہ اپنے تو اوروں پہ احتساب مرے

کسی سوال کا ان سے جواب بن نہ پڑا
سمجھتے کیسے کہ جھگڑے۔تھے بے حساب مرے

اب آندھیوں کی ہنسی گونجتی ہے ہر جانب
کہ چھنتے جائیں مرے ہاتھ سے گلاب مرے

کہاں کہاں نہ سلاوت نگر سجے سیفیؔ
یہ قریہ قریہ دھواں، شہر زیر آب مرے





چھڑ گئی بات زمانے میں اکیلے پن کی
آگ لیتی ہے خبر ایک مہکتے بن کی

جاگ اُٹھے ہیں مرے دل میں سریلے نغمے
ساز میں چھپ گئی آواز کہیں جھانجھن کی

قدحِ حرف میں آیا ہے نگاہوں کا سرور
قدر کس طرح نہ ہوسکتی ہمارے فن کی

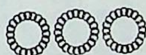
جان پر کھیل گیا ، پھاند چلا ہے دیوار
آنے والوں کے لئے جس نے گلی روشن کی

ہم نے طوفانوں سے خوشبوئیں چھپا رکھیں ہیں
وقت آئے گا تو ہم بات کریں گے من کی

تو نے اپنے بھی گریباں میں کبھی جھانکا ہے
فکر رہتی ہے تجھے ایک مرے دامن کی

اب جبیں برسے تو بنتے ہیں وہ جادو کے چراغ
خواہشیں ہیرے اُگلتی ہیں جہاں نردھن کی

پھر صبا لائی ہے پیغام ختن کا سیفیؔ
پھر ثریّا پہ نظر اُٹھنے لگی آنگن کی





صحرا ہی میں گزری ہے کبھی گھر نہ گئے ہم
دیکھا کبھی امکان سے باہر نہ گئے ہم

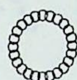
پار ہوتے ہوئے طرۂ دستار پہ آنکھیں
موجوں میں بھی آئینے سے باہر نہ گئے ہم

کھڑکی سے ذرا نیچے تھا بہتا ہوا دریا
ہاتھوں میں لئے دل کا تو ساغر نہ گئے ہم

سونے کے پہاڑ اس نے اشاروں سے سجھائے
موتی سے بھرے سات سمندر ، نہ گئے ہم

سیفیؔ یہ شعاعوں سے بنی ، شہر پناہیں
لگتی بہت اچھی ہیں ، پر اندر نہ گئے ہم





جب دُھواں سا کسی کونے سے نمایاں ہوتا ہے
گھنے جنگل کا تو جنگل ہی ہراساں ہوتا ہے

حق شناسی ، گرم سیری ، سخت گیری پیراہن
آندھیوں میں دل چراغ تہہ داماں ہوتا ہے

اُٹھتی دیواریں تقدس کی ہیں سائے محرم ہیں
پھیلتی خوشبو میں ہر لمحہ غزل خواں ہوتا ہے

ریت کے ٹیلوں کی آنکھوں میں بسر ہوجاتی ہے
پاس دریا ہو تو صحرا بھی نگہباں ہوتا ہے

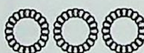
اک اک چٹان کو دریا کا سر پہچانتا ہے
ساحل کا کیا ہے ، ساحل تو تن آساں ہوتا ہے

رات کے پچھلے پہر دامن دریا کا چھُوٹا تھا
رات کی گہرائی میں سورج خراماں ہوتا ہے

دور سے یوں سر ہلا کر تو نہیں پوچھا کرتے
دہر ہلکے سے اشارے پہ مہرباں ہوتا ہے

دیکھ ، سیفیؔ سنگریزے بھی گہر بن جاتے ہیں
تو نہیں مانے گا ایسا بھی مری جان ہوتا ہے

فروری ۱۹۹۶ء





سفینہ ہوں، رواں دریا، اُٹھا چکا ہے مجھے
اک آبشار دھانے پہ لا رہا ہے مجھے

ہزار آئینے راہوں پہ منتظر ہیں مرے
زمانہ دیکھئے کس ڈھب سنوارتا ہے مجھے

میں مسکراؤں تو ہرگز مجھے غلط نہ سمجھ
کہ جلتے پیڑ کے سائے کا آسرا ہے مجھے

تو میری مان، یہاں لمحہ لمحہ سولی ہے
جواب کیا ہے، دوراہا جو گھورتا ہے مجھے

یہی تو ہے کہ ہر آنگن میں روشنی پُہنچے
ہٹے ہٹے نہ یہ دیوار ورنہ کیا ہے مجھے

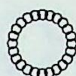
کبھی مری کھلی پیشانی پر جو بل آیا
میں جانتا ہوں کہ اپنا ہی سامنا ہے مجھے

مجال کیا ہے کہ ہمت کا بادباں ٹوٹے
قدم قدم پہ تو گرداب روکتا ہے مجھے

کسے پڑی ہے کہ ساحل کی سوچ لوں سیفیؔ
ابھی تو پار تک طوفاں میں تیرنا ہے مجھے

۱۷ مارچ ۱۹۹۶





گرد صحرا ہے ، کسک درد کے ماروں کی ہے
لے جو اُٹھی ہے ،تو یہ میرے ہی یاروں کی ہے

چند نقطے ہیں کہ امکاں میں جُڑ جاتے ہیں
فہم کی بات ، کرامات اشاروں کی ہے

شمع جلتی ہے تُجھے راہ دکھانے کے لئے
تیرے آنگن میں جوخوشبو ہے بہاروں کی ہے

آج کی بار مجھے کون بچا سکتا ہے
شرط البرز ، مگر برف سہاروں کی ہے

خوبیاں جب ہیں کہ دنیا کے لئے کھل جائیں
کوئی توصیف تمہاری ہو وہ یاروں کی ہے

آسماں بھی ہوا، پھولوں کی مہک سے خالی
بات گلشن میں بھی بجھتے ہوئے تاروں کی ہے

زرد چہرہ ہے، دوراہے پہ کھڑا ہوں ہر دم
گرد ماتھے پہ مرے راہگزاروں کی ہے

تو لنگڑتا ہوا کس سمت چلا ہے سیفیؔ
جانِ من، بات وہاں شاہسواروں کی ہے

۲۰ مارچ ۱۹۹۶ء



CC-0. Kashmir Treasures Collection Srinagar. Digitized by eGangotri



بدل سکی ہے نہ میری قسمت طِلا سے اب تک نُحاس میرا
کن آرزوؤں کے خوشنما کانچ سے بنا ہے لِباس میرا

میں تیز بہتی ہوئی ندی میں پھنسے ہوائے بط کا آسرا ہوں
چھلانگ ارجن کے تیر کی سی بدل سکے آس پاس میرا

وسیع صحرا کے گھپ اندھیرے میں وہ اُجالا ہدف ہے میرا
کہ خود بخود جان لے حقیقت کو یہ دِل حق شناس میرا

نگاہ کی ہے کرسمہ سازی کبھی نہ تھا کاسہ لیس سیفی
مجھے ہے پہچان موتیوں کی خیال ہے خوش لِباس میرا

خوشبو ہے صبا، درد کے صحرا میں حنا کی
نعلین اتار آ، یہ وادی ہے طویٰ کی

ہاں دور سے آئے تھے نظر گرد کے بادل
لیتا تو رہا ٹوہ میں نقشِ کفِ پا کی

وہ سرد سمندر میں اُبھرتے ہوئے طوفاں
تصویر تڑپتی ہے نگاہوں میں شنا کی

موجوں سے اُلجھتے رہے کس طرح سفینے
دریا کے تصور میں ہے تقدیر دعا کی

رشتہ، تری آنکھوں سے، جُڑا ہے مرے دل کا
اب کیسے بتاؤں میں تجھے بات بہا کی

لکھتے تو رہے ہیں مرے اعمال جبیں پر
کیا جانئے کیوں کر مری تقدیر بنا کی

چٹان کی صورت کبھی تہ سے نہیں اُبھرا
دریا مرا دشمن ہے، تو ساحل مرا شاکی

سیفی، یہ بدلتے ہوئے تکرار کے پہلو
رہتی ہے ہواؤں پہ نظر بادنما کی





تو گل اچھال کے خوشبو بکھر بھی جاتے ہیں
فضا بدلنے کو جاں سے گزر بھی جاتے ہیں

یہ لمحے مشکِ خطا و ختن پہ جن سے گرفت
دلوں کے ہاتھ سے لعل و گہر بھی جاتے ہیں

یہی نہیں کہ ہواؤں کے نام ہیں الزام
میں جانتا ہوں کہ کچھ اپنے سر بھی جاتے ہیں

ہر ایک شخص مقید ہے اپنی باہوں میں
فراغ سب کا مقدر جدھر بھی جاتے ہیں

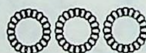


چھپی رہی صدا رعنائیوں کے دل میں صبا
سروں سے مفت میں آنچل اتر بھی جاتے ہیں

اُلجھ کے رہ گئے روشن گری میں آئینے
زمانے آنکھ جھپکتے سنور بھی جاتے ہیں

میں اپنے سامنے آیا تو ہنس پڑا اکثر
کہ ناک ڈھونڈنے ہم باختر بھی جاتے ہیں

سفر کی سمت مقرر ہے جاگئے سیفؔی
سفینہ یہ رہا، طوفاں اُتر بھی جاتے ہیں



نذرِ غالبؔ

آئینۂ تصویر ہے کیا سوچ رہا ہے
کچھ تو ہے کہ ابرو کی کماں کھینچ رہا ہے
گُل چپ ہے کہ گرداب کی آغوش کھلی ہے
دل پل سے گزرتے ہوئے کیا دیکھ رہا ہے
ہاں رات کے پردے پہ نکھرتا ہوا شعلہ
ہاں دل میں اُترتی ہوئی بربط کی صدا ہے
وہ جھیل جہاں نیل کمل جھوم رہے تھے
اب دشت ہے، دریا بھی جہاں ڈوب رہا ہے
کشتی کا نہ کیوں نام رکھیں تند خرامی
ہر قطرے میں گرداب ہے ہر موج خفا ہے
ٹھوکر سے بھی ہٹ سکتا تھا وہ راہ کا پتھر
وہ راہ کا پتھر کہ جو دیوار بنا ہے
کیا جانئے کس شہر کی قسمت ہے ثریا
آنگن سے گزرتی ہوئی پھر موج صبا ہے
سیفیؔ سے نہ ہم پوچھ لیں رودادِ سفر کی
تپتے ہوئے صحرا سے گیا آبلہ پا ہے



اصیل نافہ ، فصیلوں پہ پہرے دار ہوا ، شب
سفینہ ، اُٹھتے ہوئے گرد باد ، باد نما شب

کھلا کھلا بھرا صحرا ، نہال خون سے کانٹے
گئی نہ کشمکشِ دل ، ہوئے نہ قرض ادا شب

سفر درشت مسافت قدم قدم پہ نگاہیں
خمیدہ پُش طارمِ افلاک سازِ حرف دعا شب

یہ سنگلاخ نہ توڑیں ، وہ ریگزار کریدیں
سب عمر بھر کے بکھیڑے ، یہ آفتوں کا بہا شب

جس اک وجب سے نقش پاترے نہیں تھے ہوا پر
کھلا نہیں ابھی تجھے وہ حادثہ کہ ہوا شب

گرجتی موج کی آغوش میں ڈھلے ہوئے خارا
کہاں پہ جاگ اُٹھی پائل سنی نہ میں نے صدا شب

حلق پیاس کا صحرا، زبان سُوکھ کے کانٹا
سحر کے ڈوبتے دریا، خموش آہ رسا شب

کبھی تو آئینہ تیر نگاہ سنگ پہ لکھ دے
دلوں کے چاک سے جھانکے نہ بھول جائے ادا شب

کوئی بھی بھول ہو سیفیؔ، یہ جان اس کی سزا ہے
رکے نہ روز کا خنجر، کرے نہ تیر خطا شب





آج تک چشمِ فلک سوچ نہ جانے کیا کیا
ہیں نگاہوں میں مری مال خزانے کیا کیا

اپنے ہوتے ہوئے جن کو نہ پہچان سکوں
میرے دل پر بھی گزرے ہیں زمانے کیا کیا

کتنے جنگل ہیں جنہیں صاف کرانا ہے ابھی
ہم اکیلے ہی چلے شہر بسانے کیا کیا

سایۂ گُل کا ہے اعجاز غزل کا انداز
حوریں آتی ہیں مجھے راز سنانے کیا کیا

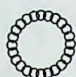
شاخِ گل، شانِ تموّج تو کہیں اور دکھا
ہیں ختن سر پہ اُٹھاتے ہوئے شانے کیا کیا

سینکڑوں طرح سے آ آ کے رلاتے ہیں مجھے
گزرے لمحے بھی بناتے ہیں بہانے کیا کیا

مسکرائیں تو سہی یہ رہا آئینۂ دل
آپ کو آتے ہیں پھول کھلانے کیا کیا

مو قلم جن کے یہاں ہار چکا ہے سیفیؔ
رنگ پھولوں کے بنائے ہیں خدا نے کیا کیا





جینے کا یوں حساب کریں کیا خیال ہے
ہر جست کی نگاہ میں لمحے کا سال ہے

یہ تو سمجھ گلاب کیوں سب کی پسند ہے
یہ ٹھیک ہے کہ خود کو سمجھنا محال ہے

تحلیل ہو کے حرف بنے ہیں ادا مری
دیکھا نہیں کہ میرا سراپا سوال ہے

تاروں پہ ڈالنے کی کمندیں، نظر میں ہیں
جکڑا ہوا زمیں سے مرا بال بال ہے

آئینے سے نگاہ ملے ، تو ملے اسے
ہر بات میں خود آپ ہی اپنی مثال ہے

اپنے گواہ آپ رہوگے تو ٹھیک ہے
بازار میں تو آج بھی قحطُ الرجال ہے

طرزِ نگاہ حکم لگائے کہاں ہے تو
تیرا جنوب اور کسی کا شمال ہے

ستر ہزار پردے میں سیفیؔ ہے بوئے گُل
تو پاسکے گا اسکو تری کیا مجال ہے





خنجر میں ہوگیا وہ روپوش بے سبب
آئینے بھی ہوئے کبھی خاموش بے سبب

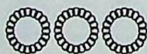
سرگوشیوں کا دور تھا صحرا میں رات تھی
اُڑتے رہے نہ شہر میں سرپوش بے سبب

طوفاں سے کشمکش بھی رہی بادباں کی سخت
دریا بھی کھولتا رہا آغوش بے سبب

ٹوٹے پہ آئینے کی زبانیں ہیں صد ہزار
سنگِ گراں ہے فکر میں کم کوش بے سبب

بڑھنے لگے جب عشق کے ناخن، تو گل مچا
گھِسنے لگی ہے حسن کی پاپوش بے سبب

سب کچھ تو جل چکا ہے مرا آشیاں کے ساتھ
سیفیؔ گھٹا ہے صاعقہ بردوش بے سبب





شہد جنگل سے جو آیا تھا ، نکھارا سارا
ہوگیا کیسی رکابی میں وہ کھارا سارا

سبدِ گل سر پہ اٹھائے ہوئے ، خنجر کھولا
آسماں صاف ہوا کیسے، خدا را، سارا

وقت کا پردہ اُٹھا ، اور جھلک سی دیکھی
کس قدر دور اُفق سے ہے کنارا سارا

کوئی کہتا ہے ، فضا زہر اُگلتی ہوگی
حادثہ کیا ہے ، یہ جس کا ہے اشارا سارا

بادباں، عزم ، نگہ ، سمت، سفر ، سیفؔی کا
موج و گرداب سمندر کا سہارا سارا





شہر کا شہر تو جاگ رہا تھا ہاں جنگل میں رات ہوئی تھی
تم بھی میرے ہمراہی تھے جب طوفاں سے بات ہوئی تھی

آکر دیکھ لکیریں میری اب کتنی اچھی چلتی ہیں
نیل گگن پر دھنک سجی ہے تم سے پہلی بات ہوئی تھی

رنگ لُٹا تو خط کے پہلو ، جُنبش کو اظہار ملا تھا
نظروں کے دامن سے لپٹی باد صبا سوغات ہوئی تھی

خاموشی کے گہرے سمندر میں جیون جیون ڈوبا تھا
آنکھوں میں صحرا جھلکے تھے دل میں وہ برسات ہوئی تھی

پھول کے سائے میں پردیسی پانی کچھ کچھ کم گہرا تھا
پاس سے جھانکا تو وہ ساعت بس نذر آفات ہوئی تھی

سرد ہمالہ کے دامن ہیں مچھلی نے دریا پایا تھا
کانٹے کانٹے کی موجوں سے اُلجھے، سیفیؔ مات ہوئی تھی



اپنے شاہد ہیں مقدر کی خبر رکھتے ہیں
ہر قدم وسعتِ امکاں پہ نظر رکھتے ہیں

کیا فصیلیں ہیں نظر آئے نہ کوئی سنگ نہ خشت
کیسے قلعے ہیں نہ دیوار نہ در رکھتے ہیں

شہسواری میں پٹے تُل گئے دکانوں پر
جو نہ صحرا کے رہے شہر میں گھر رکھتے ہیں

ڈھل کے رہ جاتے ہیں آئینوں سے راہوں کے غبار
وقت کے فاصلے دریا کا اثر رکھتے ہیں

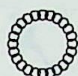
دل چلا دیتے بس آنکھ اُٹھاکر جو لوگ
کیسے سرچشمے سے فیضانِ نظر رکھتے ہیں

ابرِ نیساں کو ترستی ہوئی انگور کی بیل
یاد کی جھولی میں کیا برگ و ثمر رکھتے ہیں

ہاں سرراہ بھی ملتے ہیں خزانے اکثر
لمحے آغوش میں تابندہ گہر رکھتے ہیں

چھٹ کے رہ جائینگے راتوں کے اندھیرے سیفیؔ
دستِ امکاں میں قندیلِ سحر رکھتے ہیں





گئے لمحے تو کبھی لوٹ نہیں آنے کے
خوش نما گھومتے چکر مرے پیمانے کے
اُٹھتی، تقدیس کی دیوار، بھڑکتے شعلے
چپکے، احساس کے آئینے میں، تھرّانے کے

ثانئے رنگ بدلتے ہوئے احساسِ عمق
غم و اندوہ کی دنیا میں بکھر جانے کے

سن لے آواز زمانے کی، یہ افکارِ شنیع
بار نظروں میں نفاست کی نہیں پانے کے

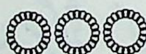
اپنے ہاں کہنے، نہیں کہنے کے انداز پرکھ
اور اسباب ہیں اب جینے کے مرجانے کے

رہ میں ابھرے ہوئے بے نام ہمالوں کی قسم
دام بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ستانے کے

کِس کے سر باندھئے سہرا کہ ارادے ہیں عجب
عقل کی گاڑی کے پٹڑی سے اتر جانے کے

کس کو شاباش ملے گی کہ تماشے ہیں عجب
بیل گاڑی کے پہاڑوں سے لُڑھک جانے کے

کون سنتا ہے مری بات کسے پروا ہے
پرخچے اٹھ گئے سیفؔی، مرے افسانے کے





نذر میر

آنکھیں موند کے چلنا ہوگا شعار کسی سودائی کا
چپے چپے پر کانٹے ہیں پھر عالم تنہائی کا
کھڑی چٹان کے گرد اُترتی پگڈنڈی دانائی کی
جوڑنے کیا بیٹھے گا کوئی آئینہ عذرائی کا
دل میں چھپ کر ٹانگ پکڑنے والے چوروں کو دیکھا
جو تقویٰ کی راہ میں کارن بنتے ہیں پسپائی کا
اِدھر کسی کی پگڑی اُتری اُدھر کسی کا دھن ڈوبا
شہرِ خیال میں بھی کھلتا ہے منظر ہاتھا پائی کا
وقت کے بڑھتے فاصلے کی سرگوشی کیا کچھ کہتی ہے
دل میں پھول کھلا سکتا ہے کوئی سُر شہنائی کا
گرتی دیواروں کے سائے سائے کب تک چلئے گا
کیا پھولوں نے دیکھ لیا تھا خواب یہی رعنائی کا

میر کی بات ہی کیا ہے سیفی وہ تو سب سے یکتا ہیں
حشر تلک چرچا تو رہے گا اُن کی سُخن سرائی کا

موجوں سے بات ہو تو نظر بادباں پہ رکھ
شائستگی نگاہ کی لفظ و بیاں پہ رکھ

آئینے کی پناہ اداکاریوں کا حسن
خارا میں گل کھلیں تو زمیں آسماں پہ رکھ

دھندلے سے دائرے ہیں یمین و یسار میں
ہاں تیر انتخاب کو جھکتی کماں پہ رکھ

نغمے چھپے ہوئے ہیں خموشی کی آڑ میں
ساحل کہ بحر، ساز کا سرگم سماں پہ رکھ

بس ایک ہاتھ پر ہے فلک ' ہمّت بلند
ہم آ رہے ہیں پاؤں ابھی نردباں پہ رکھ

شمشیر کی طرح جو زباں آوری کرے
سیفؔی جواب اس کا تُو نوک سناں پہ رکھ





کتنا ظالم ہے لڑنے کو آیا تو
چھین لئے پہلے مجھ سے ہتھیار مرے

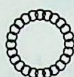
میں ہی تو منزل تک پہنچ نہیں پا یا
آگے ہیں مجھ سے کچھ اور بھی یار میرے

کِتنے لِبادے اوڑھ کے پھر تا رہتا ہوں
کُھلتے جاتے ہیں دِل کے اسرار میرے

مُنہ پر مُہر لگی رہتی ہے کیوں سیفیؔ
کب پائیں گے حُسن تقاضا بار میرے

میرا دیواں بھی تو اک مِیخانہ ہے
پڑھ کے رہتے ہیں سرشار تو سب دِلدار میرے





رنگ دانش کا بھی چڑھ سکتا ہے نامعقول پر
فن گرا سکتا ہے پردے حرف کے مشمول پر

پاؤں کیا پھسلا کہ ہم راہوں کے پتھر ہو گئے
سخت ہیں کتنی سزائیں اک ذرا سی بھول پر

کھلتی شادابی ، مہک اور چہچہاتی خامشی
حُسن کی تعریف میں کیا کیا لکھا ہے پھول پر

دیکھ پیچھے سے چلے آتے ہیں کل کے راہرو
ذرے ذرے میں جگائیں قمقمے ہم دھول پر

پیار کی سندر دھنک لہراتی جائے چار سو
دیکھ لینا کیا لکھا ہے پیار کے ترشول پر

دُور افق سے دور، تاروں سے پرے ساحل کی گونج
اور ہمت کا پھریرا جھومتا مستول پر

دھند میں پوشیدہ ہوسکتی ہیں گہری کھائیاں
بے حسی چلتی رہے گی خیر سے، معمول پر

تالیاں بجتی ہیں سیفیؔ جس طرف قاتل گیا
جرم عائد ہو تو کیسے بازوئے مسؤل پر

دسمبر ۲۰۰۶





کہاں کہاں تھے چھپے اشتہار دیکھ لیا ہے
وقار دیکھ لیا، انکسار دیکھ لیا ہے

صبا کو پوچھ رہی تھی کہ اپنی نگہتیں سونپے
شگفتگی کو سرِ شاخسار دیکھ لیا ہے

نگاہ رکھنے والوں کے سہارتے تبسّم میں
ہزار بار تجھے سنگسار دیکھ لیا ہے

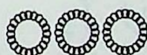
سیاہ رات کا دریا کہ آفتاب کو نگلے
سفینۂ گلِ تر کا سوار دیکھ لیا ہے

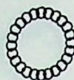
ڈبونے کو مری کشتی جھگڑ رہی ہیں ہوائیں
عجیب معرکۂ کار زار دیکھ لیا ہے

کنول ہیں دل کا مقدر صراحتوں کے اثر پر
وہ حرف حرف سے اڑتا غبار دیکھ لیا ہے

مسرتوں کے تعاقب کا روپ دھارتے سُوتے
امنگ امنگ پہ تجھکو سوار دیکھ لیا ہے

جلا کے رکھدئے سیفیؔ ہزار قافلے دل نے
سنورتی سوختگی کا شعار دیکھ لیا ہے





اس عہد میں دل کا سکوں کیسے ہوا نایاب سا
کیا واقعی اگلا زمانہ ہوگیا ہے خواب سا

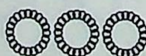
وہ دھند ہے چھائی ہوئی لپکے نہ صحرا میں ہرن
انداز کس آواز کا تاروں پہ ہے مضراب سا

ارض ختن کی ندیاں اک سمت میں بہتی نہیں
دل میں اُبھرتا ہر گماں ہے چار سو محراب سا

راہ سفر میں ہر قدم پر سر بلندی چاہئے
یوں اپنے گھر کا بوریا آئے نظر سنجاب سا

اس دیس میں پہلے کبھی اس درجہ گرمی تو نہ تھی
وادی کا ہر گوشہ ہوا ہے خطہ بے آب سا

گرمی سے پر جلتے رہے جب تاک کا سایہ ملا
نمکین پیالہ چائے کا ، سیفیؔ ، ہے شرب ناب سا





دیارِ فکر سے امکان بہرہ ور ہوگا
دلوں کا نور نگاہوں کا ہم سفر ہوگا

سرکتی صدیوں کا آئینہ صاف کہتا ہے
مرے ہی کاندھوں پہ میرے عدو کا سر ہوگا

یہاں ہزار سفینے اسی تلاش میں ہیں
کسے خبر ہے کہ کس موج میں گہر ہوگا

بلند ہوتی رہیں گی سروں سے یوں موجیں
ہزار سب کی زباں پر اُبھر اُبھر ہوگا

نگاہ بحرِ تفکر ، زباں خیال بکف
قدم قدم پہ دبستانِ خیر و شر ہوگا

ہمالے سر کئے تونے تو کیا ہوا سیفیؔ
دراز اور تمناؤں کا سفر ہوگا



دھند

دھند چھٹ جائے علامات سے کیا ہوتا ہے
بات بنتی ہی نہیں بات سے کیا ہوتا ہے

پھر مری ناو کو آغوش میں لیں گے تارے
موجِ گمُ گشتہ کی طامات سے کیا ہوتا ہے

میرے تیشے سے ٹپکتے ہیں دماوند کے سر
تو بتا تیری کرامات سے کیا ہوتا ہے

اب ارادوں کے بدلتے ہوئے تیور بھی تو ہیں
ایسے بگڑے ہوئے حالات سے کیا ہوتا ہے

دل بدل جاتے ہیں آنکھوں میں ضیا آتی ہے
بات سے نکلی ہوئی بات سے کیا ہوتا ہے

دیکھ ہر کھ سے ابھرتا ہوا سورج سیفی
چارسو پھیلی ہوئی رات سے کیا ہوتا ہے





لبادے اوڑھ کے پھرتے رہوگے یوں کب تک
بس ایک اور گھڑی تو ہے آخرِ شب تک

یہ پھول واقعی شایانِ کج کُلاہی ہیں
پہنچ بھی جائینگے یہ ۔ کیا کیجئے مگر۔ سب تک

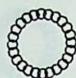
ہمیشہ بند نہیں رہ سکینگے دروازے
پہنچ بھی جائے گی آواز تو مری رب تک

وہ حرفِ جار جو اسموں کو زیر دیتا ہے
وہ حرفِ جار اگر آگیا کبھی لب تک

برس رہی ہے فلک سے ردائے شب تابی
خجالتوں کی تگ و دو ہے ماہِ نخشب تک

حصار تھام کے رکھنا کھلیں نہ دروازے
خود اپنے آپ سے سیفیؔ لڑیں گے ہم جب تک



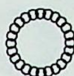


آگے راہ گذر انجانا آتا ہے
پھر راہی جانا پہچانا آتا ہے

پیرِ فلک سورج نہ اٹھا کر لے جائے
روشنیوں کا اک دیوانا آتا ہے
پھر ترتیب میں آتا ہے آفاق مگر
پہلے اک چھوٹا سا گھرانا آتا ہے
دل کے سمندر سے اٹھتے گھرے بادل
چپکے چپکے مینہ برسانا آتا ہے
سیڑھی سے چڑھتی آہٹ کے سازینے
کیا دل میں طوفان جگانا آتا ہے

اک اک دل میں شمع کی لو جاگے سیفیؔ
کہتے ہیں تاریک زمانا آتا ہے





گہرائی سے رنگ اڑا کر صورت سازی کرتے ہیں
لمحے کیسے لعل و گہر کی پس اندازی کرتے ہیں

نقطے نقطے کا لیتے ہیں بات سمجھنے والے حساب
کہنے والے سوچ سمجھ کر سخن طرازی کرتے ہیں

دل جمعی سے بیٹھے ہیں ہم ساحل پر آئینہ لئے
طوفانوں کے عکس ہماری سفینہ سازی کرتے ہیں

پورب کا بن باسی جوگی لمبی تان کے کیا سوئے
پچھّم کے چلتے جھونکے جب دست اندازی کرتے ہیں

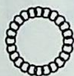
اس کی ہر خواہش پوری ہو وہ خواہش کو چھوڑ تو دے
آو کبھی ہم اپنے آپ سے سودے بازی کرتے ہیں

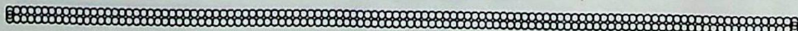
سیفی تو نے اپنے آپ کو کب سے فرشتہ جانا ہے
یہ کھلتے اعمال ترے دل کی غمازی کرتے ہیں

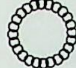




اب آو ڈل میں اگائیں اک اور نیل کمل
اب آو کوئی اضافہ کریں بہاروں میں
مہک رہا ہوں تعجب کی بات ہی کیا ہے
کہ میں نے عمر گزاری ہے گلعذاروں میں







ہر گل کو بے نیازیَ صحرا کا احترام
دریوزہ گر نگاہ کا ہے کاسہ کرام

باد صبا کی آنکھ بھی اُٹھتی تو جانتے
گل نے لیا نہ تھا کبھی گوہر سے انتقام

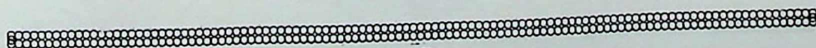
آئینے کو ملی ہیں نئی مسکراہٹیں
کُحلِ بصر کے سنگ تُلا ہے مرا کلام

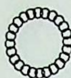
یوں شوکتِ چنار سے شاخوں کو نوچنا
فصلِ خزاں کی آندھیو تمکو میرا سلام

آنکھوں کی راہ سے اگر دل میں اتر سکے
آئینے کی نگاہ ہے شمشیرِ بے نیام

سیفیؔ مہک رہا ہے تمنا کا انگ انگ
صحرائے دل میں کونسی خوشبو لئے ہے شام







لمحہ حسن طلب کیا بار بار آیا نہیں
دل کے صحراوں میں پیغام بہار آیا نہیں

ہاں اگر باد صبا گُنجک میں اپنی باندھ لے
مدتوں سے اس طرف کوئی سوار آیا نہیں

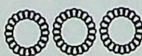
تو نے جاناں جب سے وہ ترچھی نظر ڈالی نہیں
دیکھئے، گلشن کے پھولوں پہ نکھار آیا نہیں

وہ گلی خالی پڑی ہے، ہمنوا خاموش ہیں
چھیڑنے خوشبو کا جھونکا دل کے تار آیا نہیں

میں جو سولی پر سے اب تمکو پکاروں بھی تو کیا
جیتے جی رویا کسی کو اعتبار آیا نہیں

جس پہ لکھا ہو حسین تاروں کی جنت سطر سطر
آہ گام ایسا تو کوئی سبزہ زار آیا نہیں

یہ دعا پڑھتے ہوئے سیفؔی کہ سب کی خیر ہو
کونسا لمحہ تھا جو سبحہ شمار آیا نہیں





خموشی ، سفر ساز و آواز تک
متاعِ سخن حرف سے راز تک

سمندر کو چیرا تو ڈوبے افق
بہت خوف رہتا تھا آواز تک

چراغوں کا کھاتے رہے ہیں دھواں
سرِ صبح پہنچے جو اعجاز تک

اڑانیں تو ہمت کا مقیاس ہیں
سفر ہے ممولے کا شہباز تک

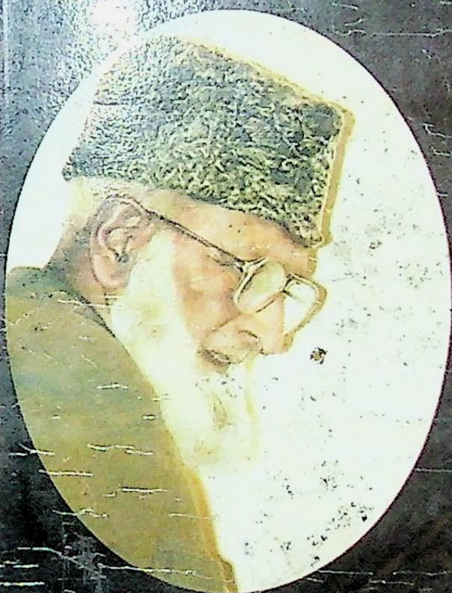
سرِ آب تصویر کھچتی رہی
حسیں دائرے میں اُڑے قاز تک

غزالوں کا سیفی نے دیکھا ہے رقص
اجڑتی تمناؤں سے ناز تک









ڈھونڈتا ہوں جس کو سیفیؔ ہے وہ پہلو کا چراغ
رات ہے اور جا رہا ہوں دِل کے صحرا کی طرف

Mehak Printing Press Sgr. #9419063159